

ایجاد وابداعِ عالم
سے عالمی نظامِ خلافت تک
تنزیل اور ارتقاء کے مراحل

ڈاکٹر اسرار احمد

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

ایجاد وابداعِ عالم
سے
عالمی نظامِ خلافت
تک
تنزیل اور ارتقاء کے مراحل

— تحریر —

ڈاکٹر اسرار احمد

مکتبہ خدام القرآن لاہور

36۔ کئے ناؤل ٹاؤن لاہور فون: 03-5869501

تقدیم

محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کا تحریر کردہ زیر نظر مضمون فلسفہ و حکمت کے نہایت دقیق اور اعلیٰ ترین مباحث پر مشتمل ہے۔

”حقیقت انسان“ کے عنوان سے ایک نہایت قیمتی تحریر آج سے قریباً پندرہ برس قبل محترم ڈاکٹر صاحب کے قلم سے نکلی تھی جو اب ”زندگی، موت اور انسان“ نامی کتابچے میں شامل ہے۔ اس کا دوسرا حصہ جس سے درحقیقت نہایت دقیق علمی مباحث کا آغاز ہوا، بعد ازاں ”حکمت قرآن“ بابت مارچ / اپریل ۸۵ء میں شائع ہوا تھا۔ تاہم یہ مضمون گزشتہ چودہ سال سے ادھورا اور نامکمل تھا۔ بھرپور دعوتی و تحریری مصروفیات کے باعث وہ ضروری فراغت میسر نہ آسکی تھی جو ایسے غامض مضامین کی تحریر کے لئے ناگزیر ہوتی ہے۔ بہر کیف، بحمد اللہ حال ہی میں محترم ڈاکٹر صاحب نے اس مضمون کو پایہ تکمیل تک پہنچایا ہے۔ ربط کلام کے پیش نظر اس تازہ تحریر کے ساتھ جو مذکورہ مضمون کی تیسری قسط کی حیثیت رکھتی ہے، سابقہ قسط کو بھی شامل اشاعت کیا جا رہا ہے۔ ○○

ناظم نشر و اشاعت

طبع اول (اگست 1999ء) _____ 11,00

طبع دوم (فروری 2001ء) _____ 11,00

طبع سوم (جنوری 2005ء) _____ 11,00

ناشر _____ ناظم نشر و اشاعت، مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مقام اشاعت _____ 36۔ کے، ماڈل ٹاؤن لاہور

فون: 5869501-03

طبع _____ شرکت پرنٹنگ پریس لاہور

قیمت _____ 24 روپے

- ☆ ۵ وجوب سے امکان کا سفر
- ☆ ۶ سلسلہ تنزلات کا مرحلہ اول
- ☆ اور اس سے متعلق اصطلاحاتِ قرآنی
- ☆ ۲۰ سلسلہ تنزلات کا مرحلہ ثانی
- ☆ ۲۳ سلسلہ تنزلات کا مرحلہ ثالث
- ☆ ۲۵ حیاتِ ارضی کا ارتقاء
- ☆ ۳۳ تکمیل تخلیق آدم — اور — عطاءِ خلعت خلافت
- ☆ ۳۶ ابلیس کا اعلانِ بغاوت اور اس کا سبب
- ☆ ۳۹ ابلیس کی انسان دشمنی اور معرکہ خیر و شر
- ☆ ۴۶ رحم مادر میں تخلیق آدمؑ کے مراحل کا اعادہ
- ☆ ۴۹ نوعِ انسانی کا ذہنی اور عمرانی ارتقاء

﴿هُوَ اللَّهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ....﴾ (الحشر : ۲۴)
 ”وہ اللہ ہے، پیدا کرنے والا، نکال کھڑا کرنے والا، صورت گری کرنے والا...“

﴿إِنَّمَا أَمْرُهُ إِذَا أَرَادَ شَيْئًا أَنْ يَقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ ۝﴾
 (یس : ۸۲)
 ”اس کے امر (کی شان) تو بس یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کا ارادہ فرمالیتا ہے تو (بس یہ) کہتا ہے کہ ”ہو جا“ تو وہ ہو جاتی ہے۔“

﴿أَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ ۚ تَبَرَّكَ اللَّهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ ۝﴾
 (الاعراف : ۵۴)
 ”آگاہ ہو جاؤ! کہ اسی کے ہیں خلق اور امر (دونوں) بڑی برکت والا ہے جو رب ہے تمام جہانوں کا۔“

﴿الَّذِي خَلَقَ فَسَوَّى ۝ وَالَّذِي قَدَّرَ فَهَدَى ۝﴾
 (الاعلىٰ : ۳۰۲)
 ”جس نے پیدا کیا اور تناسب قائم کیا۔ اور جس نے اندازہ ٹھہرایا پھر راہ معین کی۔“

﴿هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَىٰ الدِّينِ كُلِّهِ﴾ (التوبة : ۳۳، الفتح : ۲۸، الصف : ۹)
 ”وہی (اللہ) تو ہے جس نے اپنے رسول (محمد ﷺ) کو اہدیٰ (قرآن حکیم) اور دین حق کے ساتھ بھیجا تاکہ اسے پورے کے پورے دین پر غالب کر دے۔“

وجوب سے امکان کا سفر

یہ تو سب جانتے ہیں کہ صرف ذاتِ باری تعالیٰ ”واجب الوجود“ اور ”قدیم“ ہے — جبکہ کل کون و مکان اور انسان سمیت جملہ مخلوقات و موجودات ”ممکن“ اور ”حادث“ ہیں — لیکن اصل مسئلہ یہ ہے کہ ”وجوب“ سے ”امکان“ اور ”قدم“ سے ”حدوث“ کا سفر کیسے اور کن مراحل سے گزر کر طے ہوا — اور آیا اس طویل سفر میں ”تنزل“ ہی ”تنزل“ ہے، یا کوئی مرحلہ ارتقاء کا بھی آیا ہے؟

اس مشکل بلکہ تقریباً لاخیل مسئلے کا ایک حل تو قدیم منطق اور فلسفے کے ماہرین نے کیا — کہ ”واجب“ سے ”ممکن“ اور ”قدیم“ سے ”حادث“ کے مابین ”عقولِ عشرہ“ اور ”نہ افلاک“ تصنیف کر ڈالے جن کے لئے کوئی دلیل نہ تجرباتِ علم میں ہے نہ وحیِ آسمانی میں! اسی طرح بعض متصوف المزاج بزرگوں نے مرتبہ احدیت و واحدیت وغیرہ کے حوالے سے تنزلاتِ ستہ تجویز کئے، لیکن ان کے لئے بھی کوئی صریح اساس نہ عقل میں ہے نہ نقل میں!

خود وحیِ آسمانی نے بھی اس کے ضمن میں نہ تفصیلی بحث کی نہ صراحت سے کام لیا بلکہ صرف ”اشارات“ پر اکتفا کیا۔ اس لئے کہ اس کا اصل مقصد ”ہدایت“ اور ”صراطِ مستقیم“ کی وضاحت ہے اور اس کے ضمن میں بھی اس نے عوام کی ضروریات اور ان کے فہم و شعور کی سطح کو زیادہ پیش نظر رکھا ہے اور دقیق حقائق و معارف کے ضمن میں اجمالی اشاروں پر اکتفا کیا ہے کہ —

”عاقلاں را اشارہ کافی است!“

البتہ ع ”عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سمے جاتے ہیں!“ کے مصداق وہ ”علم الاسماء“ جو آدم علیہ السلام کو ابتداء ہی میں عطا کر دیا گیا تھا اور اس طرح گویا نوعِ انسانی میں بالقوہ (Potentially) ودیعت کر دیا گیا تھا، ظہور و بروز کی بے شمار منزلوں سے گزر کر اب اس مقام تک پہنچ گیا ہے کہ ”تخلیق“ اور ”تسویہ“ کی تحقیق و تفتیش سے بڑھ کر ”تکوین“ یا ”ایجاد و ابداع“ کے در پر دستک دے!

سلسلہ تنزلات کا مرحلہ اول

اور اس سے متعلق اصطلاحاتِ قرآنی

وحیِ آسمانی ”تکوین“ یا ”ایجاد و ابداع“ کی اساس اللہ تعالیٰ کے کلمہ ”کن“ کو قرار دیتی ہے — ”نفخائے آیاتِ قرآنیہ :

(۱) ﴿وَإِذَا قَضَىٰ أَمْرًا فَإِنَّمَا يَقُولُ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ ۝﴾

(البقرہ : ۱۱۷)

(۲) ﴿إِذَا قَضَىٰ أَمْرًا فَإِنَّمَا يَقُولُ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ ۝﴾

(آل عمران : ۴۷)

(۳) ﴿سُبْحَانَهُ ۖ إِذَا قَضَىٰ أَمْرًا فَإِنَّمَا يَقُولُ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ ۝﴾

(مریم : ۳۵)

(۴) ﴿فَإِذَا قَضَىٰ أَمْرًا فَإِنَّمَا يَقُولُ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ ۝﴾

(المؤمن : ۶۸)

یہ چاروں آیات تو تقریباً ہم معنی ہیں — اور ان سب کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی بات کا فیصلہ کر لیتا ہے تو اس کے لئے اس کا بس یہ کہنا کفایت کرتا ہے کہ ”کن“ اور وہ ہو جاتی ہے — البتہ دو مزید آیات میں ذرا اظہار

کا انداز ہے :

(۵) ﴿ إِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَيْءٍ إِذَا أَرَدْنَاهُ أَنْ نَقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ ۝ ﴾

(النحل : ۴۰)

”جب ہم کسی چیز کا ارادہ کر لیتے ہیں تو اس کے لئے بس ہمارا یہ کہنا ہی (کافی) ہوتا ہے کہ ”ہو جا“ تو وہ ہو جاتی ہے!“

(۶) ﴿ إِنَّمَا أَمْرُهُ إِذَا أَرَادَ شَيْئًا أَنْ يَقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ ۝ ﴾

(یس : ۸۲)

”اس کے امر (کی شان) تو بس یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کا ارادہ فرما لیتا ہے تو (بس یہ) کہتا ہے کہ ”ہو جا“ تو وہ ہو جاتی ہے۔“

یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم جہاں اللہ تعالیٰ کے فرامین و فرمودات، اوامر و احکام، نواہی و قوانین اور فیصلوں اور طے شدہ امور کو ”کلمات“ سے تعبیر کرتا ہے وہاں مندرجہ ذیل دو آیات میں اس کا پورا امکان موجود ہے کہ ”کَلِمَاتُ رَبِّي“ اور ”كَلِمَاتُ اللَّهِ“ کے لاتعداد ہونے سے مراد جہاں اللہ تعالیٰ کے علم و حکمت کا لامحدود ہونا ہو وہاں اس کی ”مخلوقات“ کا ”لَا يُحْصَى“ ہونا بھی ہو، اس لئے کہ فی الواقع اس کی ”مخلوقات“ ہی اس کے کمالِ علم، کمالِ حکمت اور کمالِ قدرت کی نشانیاں یعنی ”آیات“ ہیں۔ اس معنی میں گویا ہر مخلوق اللہ کے ایک کلمہ ”کُن“ کا ظہور ہے :

(۱) ﴿ قُلْ لَوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادَ لِكَلِمَاتِ رَبِّي لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ أَنْ

تَنْفَدَ كَلِمَاتُ رَبِّي وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهِ مَدَدًا ۝ ﴾

(الكهف : ۱۰۹)

”کہہ دو کہ میرے پروردگار کے کلمات کے لئے اگر سمندر روشنائی بن جائے تو وہ بھی ختم ہو جائے گا اس سے پہلے کہ میرے رب کے کلمات ختم ہوں۔ خواہ اس جیسا ایک اور سمندر لے آئیں مدد کے لئے!“

(۲) ﴿ وَلَوْ أَنَّ مَا فِي الْأَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ أَقْلَامٌ وَالْبَحْرُ يَمُدُّهُ مِنْ بَعْدِهِ سَبْعَةُ أَبْحُرٍ مَا نَفِدَتْ كَلِمَاتُ اللَّهِ ۖ ﴾ (لقمن : ۲۷)
 ”اور اگر زمین کے کل درخت قلم بن جائیں اور سمندر (سیاہی کا کام دے اور) اس کے بعد سات سمندر اور ہوں مدد کے لئے، تب بھی اللہ کے کلمات ختم نہ ہوں گے۔“

مندرجہ بالا آیات کے عمومی اسلوب سے قطع نظر قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ کی جملہ مخلوقات و ایجادات میں سے تعین کے ساتھ صرف حضرت مسیح علیہ السلام کو ”کَلِمَةُ اللَّهِ“ قرار دیا گیا ہے — جیسے سورۃ آل عمران کی آیت ۳۰ میں حضرت زکریا کو حضرت یحییٰ علیہ السلام کی ولادت کی خوش خبری کے ضمن میں حضرت یحییٰ کو ﴿ مُصَدِّقًا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللَّهِ ﴾ قرار دیا گیا ہے — اور ذرا آگے چل کر آیت ۴۵ میں حضرت مریم کو حضرت مسیح کی بشارت کے ضمن میں ﴿ إِنَّ اللَّهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ ﴾ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں — اور اس سے بھی زیادہ وضاحت کے ساتھ سورۃ نساء کی آیت ۱۷۱ میں فرمایا گیا ہے :

﴿ إِنَّمَا الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُولُ اللَّهِ وَكَلِمَتُهُ ۖ أَلْقَاهَا إِلَىٰ مَرْيَمَ ۖ ۝ ﴾

”بے شک مسیح یعنی مریم کا بیٹا عیسیٰ اللہ کا رسول ہے اور اُس کا ”کلمہ“ جو القاء فرمایا اس نے مریم کی جانب!“

اس کا سبب بظاہر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر شے کی ”تخلیق“ اور ”تسویہ“ کے ساتھ ساتھ ”تقدیر“ اور ”ہدایت“ کا سلسلہ بھی قائم فرما دیتا ہے، ”فُحْوَائے :

﴿ سَبِّحْ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَىٰ ۝ الَّذِي خَلَقَ فَسُوَّىٰ ۝ وَالَّذِي قَدَّرَ فَهَدَىٰ ۝ ﴾ (الاعلیٰ : ۱ تا ۳)

”تسبیح کرو اپنے اُس رب کی جو سب سے بالا و برتر ہے، جس نے بنایا پھر

سنوارا جس نے اندازہ ٹھہرایا پھر راہ معین کی۔“

یہی تقدیر و ہدایت ہے جو ”جمادات“ کی سطح پر ”قوانینِ طبیعیہ“ یعنی ”Physical Laws or Laws of the Nature“ کی شکل اختیار کرتی ہے۔ نباتات کے معاملے میں خالص طبیعی قوانین پر حیاتیاتی قوانین (Biological Laws) کا اضافہ ہوتا ہے۔ مزید آگے چل کر ”حیوانات“ کے ضمن میں ان دونوں اقسام کے قوانین پر جبلی قوانین (Instincts) کا اضافہ ہوتا ہے۔ اور انسان کے معاملے میں ان تینوں پر اضافہ ہوتا ہے ”استدلالی قوانین“ (Rules of Logic) کا — جس سے بالاتر سطح صرف ”وحی ربانی“ کی ہے! — تو جملہ مخلوقات کے معاملے میں جہاں تک معاملہ ان قوانین کے تحت چلتا رہے اللہ تعالیٰ کے کسی ”اضافی“ امر ”کن“ کی ضرورت نہیں ہوتی — لیکن جہاں ان میں کوئی تبدیلی مطلوب ہو یعنی — عمومی سلسلہ اسباب و نتائج (Cause and Effect) یا ”عادی قانون“ کو تو ذکر اللہ اپنی کسی مشیتِ خصوصی کو ظاہر فرمانا چاہے (چنانچہ اسی کو ”خرقِ عادت“ یا ”معجزے“ سے تعبیر کیا جاتا ہے!) تو ایک نئے امر ”کن“ کی ضرورت ہوتی ہے، یا جب عام اسبابِ عادیہ کی کسی کڑی کو حذف کرنا ہو تو ایک اضافی کلمہ ”کن“ اس کڑی کی جگہ لیتا ہے — چنانچہ یہ ہے وہ صورت جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معاملے میں پیش آئی کہ انسانی سلسلہ تناسل جو عام طبعی اور حیاتیاتی قوانین کے مطابق ”مرد“ اور ”عورت“ کے ”نطفہ اُمشاج“ سے شروع ہوتا ہے، آنجناب کے معاملے میں اس قدر بدل گیا کہ آپ کی پیدائش بن باپ کے ہوئی، گویا ایک کڑی حذف ہو گئی اور اللہ کے ایک کلمہ ”کن“ نے ایک کڑی کی جگہ لے لی — چنانچہ وہ کَلِمَةٌ مِّنَ اللّٰهِ يَا كَلِمَةُ مِّنْهُ يَا كَلِمَةُ قَرَّ اِطَّاءِ۔

یہ بات ”متکلمین“ کے نزدیک متفق علیہ ہے کہ ”کلام“ — ”متکلم“ کی صفت ہوتا ہے۔ اسی بنا پر علامہ اقبال نے قرآن حکیم کو ”مثل حق“ قرار دیا ہے ۔

”مثل حق پنہاں و ہم پیدا است او

زنده و پاینده و گویا است او!!“

اور صفاتِ باری تعالیٰ کے بارے میں یہ بات بھی بدیہی اور متفق علیہ ہے کہ وہ ذاتِ خداوندی کے مانند اطلاقی شان کی حامل ہیں — رہی ”ذات“ اور ”صفات“ کی باہمی نسبت یعنی علامہ اقبال کے الفاظ میں ”ہیں صفاتِ ذاتِ حق“ حق سے جدا یا عین ذات؟“ تو اس تقریباً لائیکل مسئلے کا حل بھی ”لَا عَيْنٌ وَلَا غَيْرٌ“ کے سوا اور کوئی نہیں۔ (خواہ یہ بظاہر کتنا ہی مہمل نظر آئے۔)

لہذا ذاتِ باری تعالیٰ کا وہ کلمہ ”کن“ بھی جو موجودہ کون و

مکان کے کل سلسلہ تکوین و تخلیق کا نقطہ آغاز بنا، ابتداء میں

لازمًا ”مطلق“ و ”لامحدود“ — اور ”کیف“ و ”کم“ کے

جملہ تصورات سے ماوراء تھا۔ البتہ اسی کلمہ ”کن“ نے

”تنزلات“ کی منزلیں طے کرنی شروع کیں جن کے ذریعے

”وجوب“ سے ”امکان“ — اور ”قدم“ سے ”حدوث“

کی جانب سفر شروع ہوا۔

گویا ”تنزلات“ کی نسبت ذاتِ باری کی جانب نہیں اس کلمہ ”کن“ کی

جانب ہے! — یہی وجہ ہے کہ امام ربانی حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے کل

کون و مکان اور جملہ موجودات و مخلوقات کو اللہ تعالیٰ کے اسماء اور صفات کے

”اظلال“ سے تعبیر فرمایا ہے۔

اس مرحلے پر یوحنا کی انجیل کے ابتدائی چند جملے بہت دلچسپی کا باعث ہوں گے — اگرچہ صاف نظر آتا ہے کہ وہ وحی ربانی کی بجائے کسی فلسفیانہ اور متکلمانہ ذوق کے حامل انسان کے ذہن سے نکلے ہیں :

”ابتدا میں کلام تھا۔ — اور کلام خدا کے ساتھ تھا اور کلام خدا تھا۔

یہی ابتداء میں خدا کے ساتھ تھا۔ سب چیزیں اس کے وسیلے سے پیدا

ہوئیں اور جو کچھ پیدا ہوا ہے اس میں سے کوئی چیز بھی اس کے بغیر پیدا

نہیں ہوئی۔“ (یوحنا، باب اول : ۳ تا ۱)

قرآن حکیم کی اساسی اصطلاحات میں ”کلمہ“ ہی کی طرح جامع اور گھمبیر اصطلاح ”امر“ کی بھی ہے — بنیادی طور پر یہ قرآن مجید کے چند نہایت کثیر الاستعمال الفاظ میں سے ہے۔ چنانچہ لفظ ”امر“ کہیں ”مسئلہ“ یا ”معاملہ“ کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے، کہیں ”حکم“ یا ”فیصلہ“ کا مفہوم ادا کرتا ہے، کہیں ”اختیار“ اور ”قدرت“ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور کہیں اردو زبان کے کثیر المفہوم لفظ ”بات“ کے معنی میں آتا ہے — اور ان جملہ مفہیم کے علاوہ اس کا ایک خاص ”اصطلاحی“ مفہوم بھی ہے جس کے اعتبار سے یہ ”خلق“ کا مقابل، یا کم از کم ”مغائر“ ضرور ہے۔ چنانچہ سورۃ اعراف کی آیت ۵۴ میں جہاں واو عطف نے ”خلق“ اور ”امر“ کو اللہ کی ملکیت مطلقہ یا اختیار مطلق کے تحت ”جمع“ کر دیا ہے وہاں ان دونوں کے مابین ”نسبت مغائرت“ بھی قائم کر دی ہے :

﴿ اِلٰهَ الْخَلْقِ وَالْاَمْرِ طَبَرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ ﴾

(الاعراف : ۵۴)

”آگاہ ہو جاؤ! کہ اسی کے ہیں خلق اور امر (دونوں)“ بڑی برکت والا

ہے جو رب ہے تمام جہانوں کا!“

اس ”امر“ کے بارے میں دو باتیں نہایت اہم اور لائق توجہ ہیں!
 ایک یہ کہ قرآن حکیم کی جن آیات میں ”كُنْ فَيَكُونُ“ کی تکوینی شان کا بیان ہوا ہے ان سب میں بلا استثناء ”امر“ ہی کا لفظ آیا ہے — ”خلق“ کا لفظ کسی ایک جگہ بھی استعمال نہیں ہوا — یعنی یہ انداز کسی ایک جگہ بھی نہیں ملتا کہ إِذَا أَرَدْنَاهُ أَنْ نَخْلُقَ شَيْئًا فَإِنَّمَا يَقُولُ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ — اور قرآن کے مقام رفیع سے یہ بات بہت فرو ہے کہ اسے محض ایک اتفاق مانا جائے بقول غالب : —

”مجھینہ ، معنی کا طلسم اس کو سمجھیو!

جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آوے!!“

اور — ”زیر ہر لفظ غالب چیدہ ام میخانہ!!“

دوسرے یہ کہ اس کا ایک نہایت گہرا اور قریبی تعلق لفظ ”روح“ کے ساتھ ہے۔ ہفوائے آیات قرآنی :

(۱) ﴿وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الرُّوحِ طَقُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي...﴾

(بنی اسرائیل : ۸۵)

”اور وہ تم سے روح کے متعلق سوال کرتے ہیں، کہہ دو کہ روح میرے رب کے حکم میں سے ہے۔“

(۲) ﴿يُنَزِّلُ الْمَلَائِكَةَ بِالرُّوحِ مِنْ أَمْرِهِ عَلَى مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ...﴾

(النحل : ۲)

”وہ فرشتوں کو اپنے امر کی روح کے ساتھ اتارتا ہے اپنے بندوں میں سے جن پر چاہتا ہے۔“

(۳) ﴿يُلْقِي الرُّوحَ مِنْ أَمْرِهِ عَلَى مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ...﴾

(المومن : ۱۵)

”وہ ڈالتا ہے روح جو اس کے امر میں سے ہے، اپنے بندوں میں سے

جس پر چاہتا ہے۔“

(۴) ﴿وَكَذَلِكَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ رُوحًا مِّنْ أَمْرِنَا ۖ﴾ (الشُّورَىٰ : ۵۲)
 ”اور اس طرح ہم نے تمہاری طرف بھی وحی کی ہے ایک روح اپنے
 امر میں سے۔“

ان آیات مبارکہ میں سے دوسری اور تیسری آیات میں ”الرُّوحُ مِنْ
 أَمْرِهِ“ سے مراد بالاتفاق مطلقاً وحی، نبوت ہے، چوتھی آیت میں معین طور پر
 وحی، قرآنی کا ذکر ہے — پہلی آیت میں بھی بعض حضرات کے نزدیک مراد
 وحی، قرآنی ہی ہے — لیکن جمہور کے نزدیک اس سے مراد ”رُوحِ انسانی“
 ہے۔ بہر حال سر دست اصل قابل توجہ معاملہ ”روح“ اور ”امر“ کے مابین
 قریبی رشتے اور تعلق کا ہے!!!

اب اگر قرآن حکیم میں لفظ ”روح“ کے دوسرے استعمالات و اطلاقات
 پر غور کیا جائے تو جو صورت سامنے آتی ہے وہ یہ ہے :

(۱) چار مقامات (البقرہ : ۸۷، ۲۵۳ — المائدہ : ۱۱۰ — النحل : ۱۰۲)
 پر ”رُوحُ الْقُدُسِ“ کے الفاظ وارد ہوئے ہیں^۱ — اور ایک مقام
 (الشعراء : ۱۹۳) پر ”الرُّوحُ الْأَمِينُ“ کے الفاظ آئے ہیں،^۲ اور ان تمام
 مقامات پر مراد غالب اکثریت کے نزدیک حضرت جبرئیل ﷺ ہیں!

۱ ﴿وَآتَيْنَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنَاتِ وَأَيَّدْنَاهُ بِرُوحِ الْقُدُسِ﴾ (البقرہ : ۸۷ و ۲۵۳)
 ﴿إِذْ قَالَ اللَّهُ لِعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ ادْكُرْ نِعْمَتِي عَلَيْكَ وَعَلَىٰ وَالِدَتِكَ ۖ إِذْ
 أَيَّدْنَاكَ بِرُوحِ الْقُدُسِ ۖ تُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا ۚ﴾ (المائدہ : ۱۱۰)
 ﴿قُلْ نَزَّلَهُ رُوحُ الْقُدُسِ مِنْ رَبِّكَ بِالْحَقِّ لِيُثَبِّتَ الَّذِينَ آمَنُوا وَهُدًى وَبُشْرَىٰ
 لِلْمُسْلِمِينَ ۝﴾ (النحل : ۱۰۲)

۲ ﴿نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ ۝﴾ (الشعراء : ۱۹۳)

(۲) دو مقامات (المعارض : ۴ اور القدر : ۴) پر ﴿الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ﴾ کے الفاظ آئے ہیں^۱ اور ایک مقام (النبا : ۳۸) پر ﴿الرُّوْحُ وَالْمَلٰٓئِكَةُ﴾ کے^۲ — اور اگرچہ بعض رائیں اور بھی پائی جاتی ہیں لیکن جمہور کے نزدیک یہ عام پر خاص یا خاص پر عام کے عطف کا معاملہ ہے — اور ”الرُّوْحُ“ سے مراد ان مقامات پر بھی حضرت جبرئیل علیہ السلام ہی ہیں! دوسرے نمبر پر رائے یہ ہے کہ اس سے مراد ہیں ”ارواحِ انسانیہ“ یا وہ عظیم ترین فرشتہ جو گویا ارواحِ انسانیہ کا مخزن ہے!

(۳) سورۃ مجادلہ (آیت ۲۲) میں مؤمنین صادقین کے لئے اللہ تعالیٰ کی تائید کے ضمن میں ﴿اَيَّدْهُمْ بِرُوحٍ مِّنْهُ﴾ کے الفاظ آئے ہیں جس سے مراد ہے اللہ کی ”غیبی“ مدد جو جیسا کہ قرآن حکیم کے دوسرے مقامات (جیسے سورۃ انفال : ۱۲ اور سورۃ آل عمران ۱۲۳، ۱۲۵)^۳ سے معلوم ہوتا ہے، اکثر ملائکہ ہی کے ذریعے پہنچائی جاتی ہے۔

(۴) اپنی ذاتِ مبارکہ کی جانب اضافت کی نسبت کے ساتھ لفظ ”روح“ کو اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں چھ مقامات پر استعمال فرمایا ہے : تین بار تخلیق

۱ ﴿تَنْزِيلُ الْمَلٰٓئِكَةِ وَالرُّوْحِ اِلَيْهِ فِیْ یَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهُ خَمْسِیْنَ اَلْفَ سَنَةٍ ۝﴾

(المعارض : ۴)

۲ ﴿تَنْزِيلُ الْمَلٰٓئِكَةِ وَالرُّوْحِ فِیْهَا یَاۤذُنِ رَبِّهِمْ ۝﴾ (القدر : ۴)

۳ ﴿یَوْمَ یَقُومُ الرُّوْحُ وَالْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا ۝﴾ (النبا : ۳۸)

۴ ﴿اِذْ یُوحِیْ رَبُّكَ اِلَى الْمَلٰٓئِكَةِ اَنِّیْ مَعَكُمْ فَتَتَّبِعُوا الَّذِیْنَ اَمَرْتُ ۝﴾

(الانفال : ۱۲)

۵ ﴿اِذْ تَقُوْلُ لِلْمُؤْمِنِیْنَ اَلَنْ یُكْفِیْكُمْ اَنْ یُّعٰدِکُمْ رَبُّکُمْ بِقَلْبِ الْاَیِّ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ

مُنْزَلِیْنَ ۝ بَلٰی اِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوا وَتُكْفُوا وَاَتُوْکُمْ مِنْ قُدْرِهِمْ هٰذَا یُعٰدِکُمْ رَبُّکُمْ

بِعَمْسَةِ الْاَیِّ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِیْنَ ۝﴾ (آل عمران : ۷۵، ۷۴)

انسانی کے ضمن میں کہ ”تخلیق“ اور ”تسویہ“ کے مراحل کی تکمیل کے بعد اس میں اللہ نے ”اپنی روح“ میں سے پھونکا (السجدة : ۹، الحجر : ۲۹ اور ص : ۷۲) ^۱ — اور تین ہی بار حضرت مریمؑ کے ذکر میں — جن میں سے دو مقامات (الانبياء ۹۱ اور التحريم : ۱۲) پر حضرت صدیقہؑ کے بطن میں حضرت مسیحؑ کے استقرارِ حمل کے ضمن میں فرمایا گیا کہ ”ہم نے اپنی روح میں سے پھونکا۔“ ^۲ — اور ایک مقام (مریم : ۱۷) پر بایں طور کہ جو فرشتہ انہیں حضرت مسیحؑ کی بشارت دینے کے لئے بھیجا گیا تھا، اسے ”رُوحَنَا“ (ہماری روح) سے تعبیر فرمایا گیا۔ ^۳

(۵) آخری — اور موضوعِ زیر بحث کے اعتبار سے اہم ترین — یہ کہ سورۃ نساء کی آیت ۱۷۱ میں جہاں حضرت مسیحؑ کو ”کلمۃ“ سے تعبیر فرمایا گیا — وہاں ”رُوحٌ مِّنْهُ“ بھی قرار دیا گیا! ^۴

اس تفصیل سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کلمہ ”کُن“

۱ ﴿ ثُمَّ سَوَّاهُ وَنَفَخَ فِيهِ مِنْ رُّوحِهِ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ ۖ قَلِيلًا مَّا تَشْكُرُونَ ۝ ﴾ (السجدة : ۹)

۲ ﴿ فَإِذَا سَوَّيْتُهُ وَنَفَخْتُ فِيهِ مِنْ رُّوحِي فَقُولُوا لَهُ سُبْحَانَ ۝ ﴾ (الحجر : ۲۹ و ص : ۷۲)

۳ ﴿ وَالَّتِي أَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيهَا مِنْ رُّوحِنَا وَجَعَلْنَاهَا وَابَتًا آيَةً لِلْعَالَمِينَ ۝ ﴾ (الانبياء : ۹۱)

۴ ﴿ وَمَرْيَمَ ابْنَتْ عِمْرَانَ الَّتِي أَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيهِ مِنْ رُّوحِنَا وَصَدَقْتُ بِكَلِمَتِ رَبِّهَا وَكُنْتِ مِنَ الْقَائِمِينَ ۝ ﴾ (التحریم : ۱۲)

۵ ﴿ فَأَرْسَلْنَا إِلَيْهَا رُوحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا ۝ ﴾ (مریم : ۱۷)

۶ ﴿ إِنَّمَا الْمَسِيحُ عِيسَى بْنُ مَرْيَمَ رَسُولُ اللَّهِ وَكَلِمَتُهُ ۖ أَلْقَاهَا إِلَى مَرْيَمَ وَرُوحٌ مِّنْهُ ۖ ﴾ (النساء : ۱۷۱)

— اس کے ”امر“ اور لفظ ”روح“ کے مابین بڑا قریبی
رشتہ و تعلق ہے — اور ملائکہ، ارواحِ انسانیہ اور وحی کم و
بیش ایک ہی قبیل کی حقیقتیں ہیں!

ملائکہ، ارواحِ انسانیہ اور وحی کے باہمی قرب — اور ذاتِ باری سبحانہ
و تعالیٰ سے ان کے قریبی تعلق کو ظاہر کرنے والا ایک مزید لفظ ”نور“
ہے۔ چنانچہ :

(۱) یہ حقیقت تو اظہر من الشمس ہے کہ قرآن حکیم ”وحی“ کو نور قرار دیتا ہے
جیسے سورہ مائدہ کی آیات ۴۴ و ۴۶ میں تورات اور انجیل دونوں کو ﴿هُدًى
وَنُورٌ﴾^۱ سے تعبیر فرمایا گیا اور سورہ انعام کی آیت ۹۱ میں تورات کے لئے
﴿نُورًا وَهُدًى لِلنَّاسِ﴾^۲ کے الفاظ وارد ہوئے۔ اسی طرح خود قرآن
حکیم کیلئے اللہ تعالیٰ نے سورہ مائدہ کی آیت ۱۵ میں ﴿نُورٌ وَكِتَابٌ مُبِينٌ﴾^۳
سورہ اعراف کی آیت ۱۵۷ میں ﴿التَّوْرَ الَّذِیْ اُنْزِلَ مَعَهُ﴾^۴ اور سورہ
تغابن کی آیت ۸ میں ﴿وَالْتَّوْرَ الَّذِیْ اَنْزَلْنَا﴾^۵ کے الفاظ استعمال فرمائے!

۱ ﴿اِنَّا اَنْزَلْنَا التَّوْرَةَ فِیْهَا هُدًى وَنُورٌ﴾ (المائدہ : ۴۴)

۲ ﴿وَاتَيْنَاهُ الْاِنْجِیْلَ فِیْهِ هُدًى وَنُورٌ﴾ (المائدہ : ۴۶)

۳ ﴿قُلْ مَنْ اَنْزَلَ الْكِتَابَ الَّذِیْ جَاءَ بِهٖ مُوسٰی نُورًا وَهُدًى لِلنَّاسِ تَجْعَلُوْنَهٗ
قِرَاطِیْسَ تُبَدُّوْنَهَا وَتُخْفَوْنَ كَثِیْرًا﴾ (الانعام : ۹۲)

۴ ﴿قَدْ جَاءَكُمْ مِنَ اللّٰهِ نُورٌ وَكِتَابٌ مُّبِیْنٌ﴾ (المائدہ : ۱۵)

۵ ﴿فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّوْهُ وَنَصَّوْهُ وَاتَّبَعُوا التَّوْرَ الَّذِیْ اُنْزِلَ مَعَهُ اُولٰٓئِكَ هُمُ
الْمُفْلِحُوْنَ﴾ (الاعراف : ۱۵۷)

۶ ﴿فَاٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالتَّوْرَ الَّذِیْ اَنْزَلْنَا﴾ (التغابن : ۸)

(۲) فرشتوں کے بارے میں حدیث نبویؐ (مسلم عن عائشہ رضی اللہ عنہا) میں صراحت کے ساتھ مذکور ہے کہ ”اللہ نے انہیں نور سے پیدا فرمایا۔“

(۳) روحِ محمدیؐ کے بارے میں ایک مشہور حدیث میں، جو اگرچہ محدثین کے معیارِ جرح و تعدیل پر تو پوری نہیں اترتی تاہم اکثر صوفیاء ہی نہیں مفسرین نے بھی اسے قبول فرمایا ہے، ”نور“ ہی کا لفظ آیا ہے یعنی ”أَوَّلُ مَا خَلَقَ اللَّهُ نُورِي“ — اسی طرح ایک اور حدیث جس کا حوالہ تو تاحال دستیاب نہیں ہو سکا لیکن معتبر ذرائع سے معلوم ہوا کہ مولانا غلام مرشد مرحوم اسے اپنے دروس میں بیان فرمایا کرتے تھے، اس کی رو سے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے اس سوال کے جواب میں کہ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے کس چیز کو پیدا کیا — جواباً آنحضور ﷺ سے منقول ہے کہ ”نُورُ نَبِيِّكَ يَا جَابِرُ، نُورُ نَبِيِّكَ!!“ (یہ روایت اغلباً مصنف عبدالرزاق میں موجود ہے)

(۴) خود ذاتِ باری تعالیٰ کے لئے، انسانی ذہن کی محدودیت اور نارسائی کے پیش نظر، قریب ترین لفظ جو طورِ تمثیل اختیار کیا گیا، وہ ”نور“ ہی ہے — جیسے سورہ نور کی آیت ۲۵ ﴿اللَّهُ نُورُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ﴾ کے الفاظ مبارکہ — اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے منقول ”نُورًا أَنَّى يُرَى“ کے الفاظ — ان حقائق کے پیش نظر کیا یہ نتیجہ نکالنا بعید از قیاس یا دور کی کوڑی لانا قرار دیا جاسکتا ہے کہ :

تخلیقِ کائنات کے ضمن میں اللہ تعالیٰ کے اولین کلمہ ”کن“ نے اپنے تنزل کے مرحلہ اول میں ایک نورِ بسیط کی صورت اختیار کی — اور اس سے اللہ تعالیٰ نے خلعتِ وجود عطا فرمایا۔ ملائکہ اور ارواحِ انسانیہ کو، جن کی اصل ”نور“ ہے — اور جو صاحبِ تشخص اور صاحبِ شعور ہی نہیں ”خود شعوری“ کی نعمتِ عظمیٰ

سے بھی سرفراز ہیں!

اور اس میں کون سے تعجب کی بات ہے کہ ان ملائکہ اور ارواحِ انسانیہ میں سب سے پہلے خلعتِ وجود سے سرفراز ہونے والی ہستی ”نورِ محمدی ﷺ“ — یعنی ”روحِ محمدی“ ہی ہو — فِذَا هُ آبَاءُ نَاوَأْمَهَا تَنَا!!

واضح رہے کہ قرآن حکیم جس طرح نہ صرف شعور بلکہ شعورِ ذات کی حامل ان دونوں انواع (یعنی فرشتوں اور ارواحِ انسانیہ) کو ”عالمِ امر“ سے متعلق قرار دیتا ہے اسی طرح ان کے باہمی مخاطبہ و مکالمہ — اور خود اللہ تعالیٰ کے ان دونوں سے خطاب و کلام کو بھی — جس کا اصطلاحی نام ”وحی“ ہے ”عالمِ امر“ سے متعلق قرار دیتا ہے — اس موضوع پر قرآن کا ”ذروہِ سنام“ یعنی اہم ترین مقام سورۃ شوریٰ کی آیات ۵۱، ۵۲ ہیں :

﴿ وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُكَلِّمَهُ اللَّهُ إِلَّا وَحْيًا أَوْ مِنْ وَرَاءِ حِجَابٍ أَوْ يُرْسِلَ رَسُولًا فَيُوحِيَ بِإِذْنِهِ مَا يَشَاءُ ۚ إِنَّهُ عَلَىٰ حَكِيمٍ ۝ وَكَذَٰلِكَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ رُوحًا مِّنْ أَمْرِنَا ۚ مَا كُنْتَ تَدْرِي مَا الْكِتَابُ وَلَا الْإِيمَانُ وَلَكِنْ جَعَلْنَاهُ نُورًا نَّهْدِي بِهِ مَنْ نَّشَاءُ مِنْ عِبَادِنَا ۚ وَإِنَّكَ لَتَهْدِي إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ۝ ﴾ (الشُّورَىٰ : ۵۱-۵۲)

”اور کسی بشر کی بھی یہ شان نہیں ہے کہ اللہ اس سے کلام کرے مگر وحی کے ذریعے سے، یا پردے کی اوٹ سے، یا بھیجے کسی فرشتہ کو، پس وہ وحی کر دے اس کے اذن سے جو وہ چاہے۔ وہ بڑا ہی عالی مقام، بڑا ہی حکیم ہے۔ اور اسی طرح ہم نے تمہاری طرف بھی وحی کی ہے ایک روح اپنے امر میں سے، نہ تم یہ جانتے تھے کہ کتاب کیا ہے اور نہ یہ جانتے تھے کہ ایمان کیا ہے۔ لیکن ہم نے اس کو ایک نور بنا دیا جس سے ہم ہدایت

دیتے ہیں اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتے ہیں، اور بے شک تم ایک سیدھی راہ کی طرف رہنمائی کر رہے ہو۔

ان آیاتِ مبارکہ میں ”روح“ — ”امر“ — ”وحی“ — اور ”نور“ کے الفاظِ مبارکہ جو ہماری اس پوری بحث کا بنیٰ اور مدار ہیں، جس شان سے وارد ہوئے ہیں، اس کی کوئی دوسری مثال اغلباً خود قرآن میں موجود نہیں ہے (واللہ اعلم!)۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے ان دو آیات کو اس موضوع پر قرآن کا ”ذروۃ سنام“ قرار دیا ہے۔

(نوٹ : اس تحریر کا یہاں تک کا حصہ ۱۹۸۵ء میں شائع ہو گیا تھا)

الغرض! ایجاد و ابداع سے تخلیق و تسوئہ تک کے طویل سفر کا مرحلہ اول — یا بالفاظِ دیگر سلسلہ ”تنزلات“ کی پہلی منزل — جس سے قرآن حکیم کی اہم اصطلاحات: کلمہ و کلمات، روح و وحی اور امر و نور متعلق ہیں، اغلباً یہ تھی کہ ذاتِ حق سبحانہ و تعالیٰ کے امر ”کن“ نے ایک ایسے نہایت لطیف و بسیط، اور خنک و پُر سکون ”نور“ کی صورت اختیار کر لی جس میں نہ حرارت و تپش تھی، نہ حرکت و تموج! — اور اس مرحلہ پر اسی نورِ بسیط سے تخلیق کی گئیں دو صاحبِ تشخص، اور صرف صاحبِ شعور و ارادہ ہی نہیں بلکہ حاملِ شعورِ ذات (SELF-CONSCIOUS) مخلوقات، یعنی: ایک ”روح القدس“ اور ”الروح الامین“ یعنی حضرت جبرئیل علیہ السلام سمیت جملہ ملائکہ کرام جن کی تعداد لَا یَحَاطُ بھی ہے اور لَا یُحْصٰی بھی (بمفعول: ﴿وَمَا يَعْلَمُ جُنُودَ رَبِّكَ إِلَّا هُوَ!﴾)۔ (المذثر: ۳۱) اور جن کے بارے میں یہ صراحت بھی حدیثِ نبوی علی صاحبہ الصلوٰۃ والسلام میں موجود ہے کہ ان کی تخلیق ”نور“ سے ہوئی، (مسلم عن عائشہ

﴿یٰۤاٰیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا﴾ اور دوسرے روح آدمؑ اور روح محمدیؐ سمیت نسل آدم کے اُن تمام افراد کی ارواح جو تاقیام قیامت پیدا ہوں گے۔ یہ ارواح انسانیہ جو ”جُنُوْدٌ مُّجَنَّدَةٌ“ کی شکل میں تھیں، (مسلمؒ عن ابی ہریرہؓ) ان سے اَوْلاٰذَاتِ حق سبحانہ و تعالیٰ نے یہ عہد لیا کہ وہ اُسے ہی اپنا رب تسلیم کرتی ہیں اور کرتی رہیں گی (نحوائے ﴿اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ طَقَالُوْا بَلٰی﴾^۱ الاعراف : ۱۷۲) پھر ان پر ”اماتۃ الاولیٰ“ کی نیند طاری کر کے انہیں ایک ”مخزنِ ارواح“ میں محفوظ کر دیا، جہاں سے وہ اپنے اپنے وقت پر مشعب ہو کر اجسادِ انسانیہ میں پھونکی جاتی ہیں۔ (جیسے کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے، ایک رائے کے مطابق یہ ”مخزنِ ارواح“ ہی وہ ملکِ اعظم ”الروح“ ہے جس کا ذکر ملائکہ کے ساتھ معطوف یا معطوف علیہ کے طور پر قرآن مجید میں تین بار آیا ہے: المعارج : ۴، النبأ : ۳۸، اور القدر : ۴)

واضح رہے کہ تنزلات کے اس مرحلہٴ اوّل پر وجود میں آنے والے عالمِ نورانی میں ابھی زمانِ جاری (SERIAL TIME) کا کوئی تصور ہی موجود نہیں تھا لہٰذا اس مرحلے پر خلعت وجود سے مشرف ہونے والی ہستیاں یعنی ملائکہ اور ارواحِ انسانیہ بھی زمان و مکان کی محدودیتوں سے ماوراء ہیں اور ان کے عرش سے فرش اور بالعکس فرش سے عرش تک — اور مشرق سے مغرب اور مغرب سے مشرق تک منتقل ہونے میں کوئی ”وقت“ صرف نہیں ہوتا! بلکہ یہ آنِ واحد میں مشرق سے مغرب اور فرش سے عرش تک کا سفر طے کر سکتی ہیں!

سلسلہٴ تنزلات کا مرحلہٴ ثانی

سلسلہٴ تنزلات کا مرحلہٴ ثانی عالمِ امر سے عالمِ خلق کی جانب تنزل کی پہلی

۱۔ ”(تمہارے رب نے پوچھا:) کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ انہوں نے کہا: ضرور (آپ ہی ہمارے رب ہیں!)“

منزل ہے اور یہ وہ مرحلہ ہے جس تک ایک مبہم اور مجمل رسائی جدید علم طبیعیات کو بھی حاصل ہو چکی ہے۔ جس کے نتیجے میں وہ خام خیالی تحلیل ہو کر معدوم ہو چکی ہے جو نیوٹن کے دور کی طبیعیات سے پیدا ہوئی تھی، یعنی یہ کہ یہ مادی کائنات ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ قائم رہے گی۔ اس کے برعکس اب محققین کا اس پر تقریباً اجماع ہو چکا ہے کہ اس عالم مادی کا آغاز اب سے لگ بھگ پندرہ سے بیس ارب سال قبل BIG BANG سے ہوا۔ یعنی ایک بہت بڑے دھماکے سے! یہ دھماکہ کب ہوا اور کہاں ہوا ان سوالات کے جواب میں تو علماء طبیعیات یہ کہہ کر پیچھا چھڑا لیتے ہیں کہ اس سے قبل زمان و مکان کا جداگانہ تشخص تھا ہی نہیں کہ کب اور کہاں کے سوال پیدا ہوں۔ گویا کہ زمان و مکان کا تو نقطہ آغاز ہی BIG BANG ہے! رہے یہ سوالات کہ یہ دھماکہ کس نے کیا اور اس کے لئے بارود کونسا تھا تو ان میں سے پہلے سوال سے تو مادہ پرستوں کے لئے اعراض اس لئے ضروری ہے کہ اس سے لامحالہ ایک واجب الوجود مبدع و موجد کا تصور سامنے آتا ہے — اور دوسرے سوال کا جواب ان کے لئے اس بنا پر ممکن نہیں کہ BIG BANG سے ماقبل کا تعلق عالمِ امر سے ہے جس تک علومِ طبیعی کی رسائی محالِ عقلی ہے!

بہر حال ذاتِ واجب الوجود پر ایمان اور اُس (تعالیٰ) کے پہلے امر ”کن“ سے وجود میں آنے والے عالمِ نور کا ادراک رکھنے والوں کے لئے یہ سمجھنا بہت آسان ہے کہ یہ دھماکہ ذاتِ حق سبحانہ و تعالیٰ کے ایک دوسرے امر ”کن“ کے نتیجے میں نورِ بسیط کے ایک حصے میں ہوا جس کے نتیجے میں اس ”نور“ نے عہدِ حاضر کے عظیم ماہر طبیعیات سیون وائن برگ کے قول کے مطابق ایک ایسی ”نار“ کی شکل اختیار کر لی جو ایسے نہایت چھوٹے ذرات (ELECTRONS, POSITRONS AND NEUTRINOS) پر مشتمل تھی جن کا درجہ حرارت

ناقابلِ تصور حد تک بلند (ONE HUNDRED THOUSAND MILLION DEGREES CENTIGRADE) تھا اور جو ناقابلِ تصور سرعت رفتار کے ساتھ ایک دوسرے سے دور بھاگ رہے تھے۔ جس کے نتیجے میں یہ آتشیں گولہ جہم میں تیزی سے بڑھتا چلا گیا۔ اور مرورِ زمانہ کے ساتھ ان ذرات کی حرارت اور ان کے باہمی کشش ثقل کی قوت و شدت دونوں میں کمی آتی چلی گئی۔!!

الغرض! یہ تھا عالمِ مادی کا نقطہ آغاز اور مراتبِ نزول کا مرحلہ ثانی۔ بعد میں مرورِ زمانہ اور اساسی ذرات کے ایک دوسرے سے دور بھاگنے سے یہ ناری ہیولی یا گولا مختلف حصوں میں پھٹتا بھی چلا گیا جس سے کہکشاؤں وجود میں آئیں اور ہر کہکشاؤں میں ناری کرے پیدا ہوئے جن میں متذکرہ بالا اساسی ذرات کی تالیف سے ایٹم اور پھر اس کے مرکبات وجود میں آتے چلے گئے۔

بہر حال اس ناری مرحلے پر جو صاحبِ تشخص اور صاحبِ شعور و ارادہ مخلوق پیدا کی گئی وہ ”جنات“ تھے جن کا مادہ تخلیق قرآن کی جا بجا صراحت کی بنا پر آگ ہے۔ اور جن کی تخلیق حضرت آدمؑ کی تخلیق سے بہت پہلے ہوئی۔ (نفسوحائے: ﴿وَالْجَانَّ خَلَقْنَاهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَارِ السَّمُومِ﴾ ۱۰ الحجر: ۲۷)

واضح رہے کہ جیسے ”نور“ اور ”نار“ میں قرب مسلم ہے اسی طرح جنات کو بھی ملائکہ کے ساتھ قرب اور مانوسیت کا تعلق حاصل ہے۔ چنانچہ اسی کا ایک شاہکار نتیجہ یہ ہے کہ عزازیل نامی جن جو بعد میں ابلیس اور شیطان لعین قرار پایا، اپنے علم و زہد اور طاعت و تقویٰ کی بنیاد پر ملائکہ کرام کے طبقہ اسفل کے ساتھ صرف گھل مل ہی نہیں گیا تھا بلکہ بقول بعض اس نے ان کے ”معلم“ کی حیثیت بھی اختیار کر لی تھی (اللہ اعلم!)۔ اور اسی کا

ایک شاخسانہ یہ ہے کہ اگرچہ جنّات کی رسائی ملائکہ کے طبقہ اعلیٰ تک تو نہیں ہے ﴿لَا يَسْمَعُونَ إِلَى الْمَلَأِ الْأَعْلَى﴾^۱ (الصّٰفّٰت : ۸) تاہم چوری چھپے سان گن لینے ﴿الَّذِينَ اسْتَرْقَوْا السَّمْعَ﴾^۲ (الحجر : ۱۸) اور تدبیر و تعمیل احکام الہی کیلئے فرشتوں کے نزول کے دوران ان سے کچھ معلومات ”اچک“ لینے کی صلاحیت رکھتے ہیں — مزید برآں چونکہ ان کا تعلق عالم مادی سے ہے لہذا ان کی حرکت اور سفروقت کے صرف کے ساتھ ہوتا ہے، اگرچہ اپنے مادہ تخلیق کی لطافت کی بنیاد پر ان کی رفتار بھی بہت تیز ہے اور ان کی جولان گاہ بھی کائنات مادی کے دوردراز گوشوں تک ہے اور وہ نہ صرف یہ کہ ان دوردراز مقامات پر بھی از خود بآسانی پہنچ جاتے ہیں جہاں انسان ارب ہا ارب ڈالروں کے صرف سے تیار شدہ راکٹوں کے ذریعے بمشکل پہنچ پاتا ہے — بلکہ ان کی رسائی اس سے بھی بہت آگے ہے جہاں ہم تاحال پہنچ بھی نہیں پائے! — اور آخری بات یہ کہ مادہ تخلیق کی اس لطافت کی بنا پر یہ بھی فرشتوں ہی کی طرح مختلف صورتیں اختیار کر سکتے ہیں — یعنی جیسے فرشتے انسانوں کی صورت میں متمثل ہو سکتے ہیں (جیسے مثلاً ﴿فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا﴾^۳ مریم : ۱۷) ایسے ہی جنّات بھی انسانوں اور حیوانات بالخصوص حیات یعنی سانپوں کی شکل اختیار کر سکتے ہیں!

سلسلہ تنزلات کا مرحلہ ثالث

سلسلہ تنزلات کی تیسری کڑی اُس وقت شروع ہوئی جب بہت سے ناری کُترے ٹھنڈے پڑنے شروع ہوئے — جن میں ایک ہماری زمین بھی ہے۔

۱ ”یہ (جنّات) ملائ اعلیٰ کی باتیں نہیں سن سکتے۔“

۲ ”الّا یہ کہ کچھ سن گن لے لے۔“

۳ ”پس وہ اس کے سامنے ایک پورے انسان کی شکل میں نمودار ہو گیا۔“

ٹھنڈے ہونے کے اس عمل کے دو نتائج ظاہر ہوئے : ایک یہ کہ جیسے کوئی انگارہ ٹھنڈا ہونے لگے تو اس کی سطح پر راکھ کی تہہ تم جاتی ہے اسی طرح کرۂ ارضی پر بھی ”خاک“ کی ایک تہہ پیدا ہو گئی جسے زمین کا چھلکا (CRUST OF THE EARTH) کہا جاتا ہے اور جو کل حیات ارضی نباتاتی و حیواناتی کا مادہ تخلیق ہے — اور دوسرے یہ کہ زمین سے کچھ بخارات نکل کر اس کے گرد جمع ہو گئے جن سے زمین کا غلاف یعنی ”فضا“ وجود میں آئی۔ اور پھر اسی فضا میں موجود ہائیڈروجن اور آکسیجن کے امتزاج سے پانی وجود میں آیا جو کل حیات ارضی کے لئے ”منبع حیات“ ہے (منہوئے : ﴿وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ط﴾ ۱ الانبیاء : ۳۰) — اور اس نے موسلا دھار بارش کی صورت میں واپس زمین ہی پر برسا شروع کر دیا۔ گویا اس سلسلہ تخلیق کا ایک مرحلہ وہ بھی تھا جس میں زمین پر سوائے پانی کے کچھ اور نہ تھا۔ اور غالباً اسی کی جانب اشارہ ہے قرآن حکیم کے ان الفاظ مبارکہ میں کہ ﴿وَكَانَ عَوْشُهُ عَلَى الْمَاءِ﴾ ۲ (ہود : ۷) — اور ادھر چونکہ زمین کی چمڑی (CRUST) ٹھنڈے ہونے کے باعث سکڑ بھی گئی تھی لہذا سطح زمین پر نشیب و فراز پیدا ہو گئے۔ چنانچہ ایک جانب پہاڑ اور ان سے ملحق سطح مرتفع کے مختلف مدارج و مراحل کی صورت میں خشکی پیدا ہوئی تو دوسری جانب نشیبی علاقوں میں بارش کے پانی کے جمع ہونے کے باعث سمندر وجود میں آ گئے — اور پھر ساحلی علاقوں میں حیات ارضی کے ”مادہ تخلیق“ یعنی مٹی یا تراب‘ اور اس کے ”منبع حیات“ یعنی پانی کے مابین تعامل سے ”ارتقاء“ کا وہ مرحلہ وار عمل شروع ہوا جس کی انتہا حضرت آدمؑ نہیں بلکہ صرف حیوانِ آدم (HOMO SAPIENS) کا

۱ ”اور ہم نے پانی سے ہر زندہ چیز بنائی۔“

۲ ”اور اس کا عرش پانی پر تھا۔“

کاظہور تھا — گویا بقولِ بیدل —

”ہر دو عالم خاک شد تا بست نقشِ آدمی
اے بہارِ نیستی از قدرِ خود ہوشیار باش!“

حیاتِ ارضی کا ارتقاء

یہ بات بالکل غلط طور پر مشہور ہو گئی ہے کہ نظریۂ ارتقاء کا مُوجد برطانوی سائنس دان چارلس ڈارون (۱۸۰۹ء تا ۱۸۸۲ء) تھا اور اس غلط مفروضے کی شہرت اس درجہ کو پہنچ گئی ہے کہ عوام الناس میں ارتقاء اور ”ڈاروِ نزم“ تقریباً مترادف ہو گئے ہیں۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ جہاں تک حیاتِ ارضی میں ارتقاء کے مسئلے کا فی نفسہ تعلق ہے، اس کا دھندلا سا تصور تو ارسطو سمیت متعدد قدیم یونانی حکماء کے یہاں بھی موجود تھا۔ پھر اس کا نہایت واضح نقشہ صدیوں پہلے مسلمان حکماء اور علماء پیش کر چکے ہیں۔ اس ضمن میں علامہ جاحظ (م ۲۲۵ھ) پھر اخوان الصفا، اور پھر علامہ ابنِ مسکویہ (م ۴۲۱ھ) نے جو کچھ کہا اس کا حوالہ تو فی الوقت مشکل بھی ہے اور غیر ضروری بھی۔ لیکن مولانا روم (م ۱۲۷۳ء) نے ڈارون سے لگ بھگ چھ سو برس قبل اپنی شہرۂ آفاق اور زندہ جاوید ”مثنوی“ میں دو مقامات پر جس قدر واضح الفاظ میں ارتقاء حیاتِ ارضی کا نقشہ پیش کیا ہے وہ تو سب کے سامنے ہے۔

اس میں ہرگز کوئی شک نہیں ہے کہ ڈارون نے ۱۸۳۲ء سے ۱۸۳۷ء تک پورے پانچ سال جنوبی امریکہ کے پورے ساحل کے گرد سفر کر کے حیاتِ ارضی کے جو نمونے جمع کئے اور پھر ان کے مابین انسانوں کے ”شعوب“ اور ”قبائل“ (الحجرات : ۱۳) کے مانند حیوانات کی ”انواع“ (Species) کا جو

شجرہ نسب مرتب کیا، وہ اس کی ایک بہت بڑی علمی خدمت تھی، لیکن ”ڈارونزم“ اصلاً عبارت ہے اس نظریے سے جو ڈارون نے ارتقاء حیات کے سبب اور اس کے عمل میں آنے کے طریق یعنی میکانزم کے بارے میں مرتب کیا، اور جسے عوام الناس میں تو یقیناً بہت پذیرائی حاصل ہوئی لیکن خالص علمی حلقوں میں یہ نظریہ ہمیشہ متنازعہ ہی رہا، اور اب بھی اگرچہ سائنس کی عمومی رو میں تو اسی کا ڈنک بج رہا ہے تاہم علماء و ماہرین علم الحیات کے حلقے میں اس پر شدید اعتراضات وارد کئے جاتے ہیں۔ اور اس کی بجائے اب علمی دنیا میں ڈارون سے متصلاً قبل فرانسیسی سائنس دان لامارک (۱۷۴۴ء تا ۱۸۲۹ء) نے جو خیالات پیش کئے تھے ان کے مشابہ خیالات زیادہ مقبول ہو چکے ہیں!

بہر حال، نفس ارتقاء کے ضمن میں مولانا روم کی جانب رجوع کریں تو اوّلًا مثنوی کے دفتر سوم میں آنجناب فرماتے ہیں :

از جمادیٰ مُردم و نامی شدم
وز نما مُردم بچواں سرزدم
مُردم از حیوانی و آدم شدم
پس چه ترسم کہ ز مُردن کم شوم!

یعنی ”(میں) اوّلًا عالم جمادات میں تھا — پھر اس جماداتی عالم میں میری موت واقع ہوئی تو میں عالم نباتات میں پیدا ہو گیا۔ پھر عالم نباتات میں موت واقع ہوئی تو میں عالم حیوانات میں وارد ہو گیا۔ پھر عالم حیوانات میں موت واقع ہوئی تو میں آدم بن گیا۔ پس مجھے کیا خوف لاحق ہو سکتا ہے کہ اب کوئی اور موت واقع ہونے سے میرے وجود یا میری حیثیت میں کوئی کمی واقع ہو جائے گی!“ — بلکہ اس مقام پر تو مولانا روم ”مقام آدمیت سے آگے کے دو مزید مراحل ارتقاء کا ذکر بھی کرتے ہیں لیکن وہ ہمارے اس وقت کے دائرہ بحث سے خارج ہیں!

پھر اس سے بھی کہیں زیادہ واضح اور واضحکاف الفاظ میں مولانا رومؒ مثنوی کے دفتر چہارم میں باضابطہ اس عنوان کے تحت کہ: ”بیانِ اطوار و منازلِ خلقتِ آدمی از ابتدائے خلقت“ یعنی ”ابتداءِ تخلیق سے تخلیقِ آدم تک کے مراحل کا بیان“ فرماتے ہیں :

آمدہ	اول	باقلیم	جماد
وز	جمادی	در	نباتی
سالہا	اندر	نباتی	عمر
وز	جمادی	یاد	تاورد
وز	نباتی	چوں	بہ حیوانی
نامدش	حال	نباتی	یچ

باز از حیواں سوئے انسانیش
می کشد آں خالقے کہ دانیش
مہینس اقلیم تا اقلیم رفت
تا شد اکنوں عاقل و دانا و زفت!

یعنی ”وہ (اور یہاں مثنوی کے فاضل مترجم قاضی سجاد حسین صاحب نے بریکٹ میں ”روح“ درج کر دیا ہے، جو ہماری بیان کردہ تفصیل کی رو سے درست نہیں ہے۔ اس لئے کہ روح تو عالمِ امر کی شے ہے جس پر نہ کوئی تنزل واقع ہوا ہے نہ ہی وہ کسی عمل ارتقاء سے ہو کر گزری ہے — بلکہ یہ سارا سفر جو آگے بیان ہو رہا ہے ”مادہ“ کا ہے کہ وہ) اولاً جمادات کے عالم میں وارد ہوا، پھر عالمِ جمادات سے عالمِ نباتات میں در آیا۔ اور سالہا سال عالمِ نباتات میں

گزارنے کے دوران اسے کبھی عالم جمادات کی کوئی بات یاد نہ آئی۔ پھر جب وہ عالم نباتات سے عالم حیوانات میں داخل ہوا تو اسی طرح اسے عالم نباتات میں گزارے ہوئے دور کی کوئی بات یاد نہ رہی — پھر اسے عالم حیوانات سے اس ”خالق“ نے جسے تم خوب جانتے ہو عالم انسانیت کی طرف کھینچ لیا — اور اس طرح وہ ایک عالم سے دوسرے عالم تک سفر کرتا ہوا یہاں تک پہنچ گیا کہ صاحب عقل و دانش اور دانا و مینا بن گیا۔

عبد حاضر کے ”ترجمان القرآن“ اور ”رومی ثانی“ علامہ اقبال نے اپنے اشعار میں جس رفعت فکر اور نزاکت خیال کے ساتھ نہ صرف نفس ارتقاء بلکہ اس کے سبب اور نقطہ آغاز اور اس کے منتہاء اور منزل مقصود کو بیان کیا ہے واقعہ یہ ہے کہ عقول متوسطہ کے حامل لوگوں کے لئے تو اس کا فہم و ادراک مشکل ہی نہیں محال ہے — غنیمت ہے کہ ”محکمات اقبال“ کے شارح ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم و مغفور نے اپنے اس مقالہ کے ذریعے اسے کسی قدر آسان بنا دیا ہے جو مجلہ ”اقبال ریویو“ کی اشاعت بابت اپریل ۱۹۶۰ء میں شائع ہوا تھا۔

ڈاکٹر رفیع الدین نے مولانا رومی کے متذکرہ بالا اشعار کے عین مطابق ارتقاء کے طویل سفر کے تین مراحل قرار دیئے ہیں، یعنی: اولاً طبعیاتی اور کیمیائی ارتقاء، ثانیاً حیاتیاتی ارتقاء، اور ثالثاً نظریاتی یا تصوراتی ارتقاء — گویا ایجاد و ابداع کے مراتب نزول کے مرتبہ ثانی کے آغاز کے ساتھ ہی ارتقاء کا اولین مرحلہ بھی شروع ہو گیا تھا۔ یعنی ”Big Bang“ کے نتیجے میں پیدا ہونے والے انتہائی چھوٹے ”ذرات“ (Particles) کے مابین تالیف و ترتیب سے اولاً ایٹم وجود میں آئے اور پھر ان ایٹموں کے اجتماع سے سالمات یعنی ”مالی کیولز“ (Molecules) بنے — اور پھر ان ”سالمات“ کے مابین

جمع وتدوین سے اولاً غیر نامیاتی مرکبات (Inorganic Compounds) اور بالآخر نامیاتی مرکبات (Organic Compounds) وجود میں آئے، جن پر سفر ارتقاء کے اس مرحلہ اول کی تکمیل ہو گئی — واضح رہے کہ اسی مرحلے کو ہم اس سے قبل مراتب نزول کے تیسرے مرحلے کی تکمیل قرار دے چکے ہیں، جس کی نہایت حسین اور حد درجہ بلیغ تعبیر مرزا عبدالقادر بیدل نے ان الفاظ سے کی کہ ”ہر دو عالم خاک شد!“ لیکن چونکہ مراتب نزول کا یہ مرتبہ ثالث ہی ارتقاء کا مرحلہ اول بھی تھا لہذا اس کے بعد ہی ارتقاء کے دوسرے مرحلے یعنی حیاتیاتی ارتقاء کا آغاز ہوا۔ اور چونکہ اس کی تکمیل ہونی تھی انسان کی تخلیق پر لہذا اس کے آغاز کو بیدل نے ”تابست نقش آدمی!“ سے تعبیر کیا۔

ماہرینِ علومِ طبیعی نہ تو تاحال اس راز پر سے پردہ اٹھا سکے ہیں کہ ”عالمِ جمادات“ سے تعلق رکھنے والے کیمیائی مرکبات میں ”حیات“ کی نمود کس طرح سے ہوئی، نہ ہی یہ ان کے لئے کبھی آئندہ ممکن ہو گا — اس لئے کہ اس کا تعلق پھر اسی عالمِ امر سے ہے جو طبیعیات کے دائرہ تحقیق و تفتیش سے باہر ہے — یعنی اللہ کا ایک اور امر ”کُن!“ جس کے ذریعے مُردہ مادے میں ”حیات“ کا کرنٹ (Current) دوڑنا شروع ہو گیا۔

بہر حال اس کے بعد سفر ارتقاء کی دوسری منزل یعنی حیاتیاتی ارتقاء کا طویل عمل شروع ہوا، جس کے ضمن میں یہ امر تو اب پوری دنیا میں متفق علیہ ہے کہ اولاً حیاتِ ارضی کی نہایت حقیر اور سادہ صورتیں ظہور میں آئیں — اور پھر وقتاً فوقتاً درجہ بدرجہ کمتر سے برتر، اور کمتر سے بہتر صورتیں ظہور میں آتی چلی گئیں — لیکن یہاں پہلا مسئلہ تو یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا کم تر کے بعد برتر ”انواع“ کا ظہور محض ایک زمانی ترتیب کا مظہر ہے، یعنی ہر نئی نوع سابقہ کم تر نوع سے بالکل آزاد اور غیر متعلق طور پر براہِ راست اپنی مخصوص صورت میں

پردہ عدم سے براہ راست عالم وجود میں آتی رہی یا ہر بعد میں آنے والی نوع پہلے سے موجود نوع ہی میں کسی قدر تبدیلی سے وجود میں آئی؟ — تو جہاں تک خالق ارض و سماوات اور موجد کون و مکان سبحانہ و تعالیٰ کا تعلق ہے اسے یقیناً یہ قدرت اور وسعت حاصل ہے کہ وہ ہر مخلوق کو جس صورت میں بھی وہ تھی، یا ہے، یا ہوگی جداگانہ طور پر براہ راست عدم سے وجود میں لے آئے — لیکن اس کی سنت و عادت یہ ہے کہ وہ کسی بھی شے کو پیدا کر کے اس کے لئے کچھ قواعد و قوانین معین کر دیتا ہے — جو اس شے کی ”تقدیر“ بن جاتی ہیں (نفخوائے : ﴿ خَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَرَهُ تَقْدِيرًا ۝ ﴾ ۱ الفرقان : ۲) اور ﴿ الَّذِي خَلَقَ فَسُوًى ۝ وَالَّذِي قَدَّرَ فَهَدَىٰ ۝ ﴾ ۲ (الاعلیٰ : ۳۲) — پھر وہ ان ہی قواعد و قوانین کے مطابق اسے چلنے دیتا ہے۔ یہاں تک کہ جب اس کی مشیت متقاضی ہوتی ہے اس میں اپنے کلمہ ”کُن“ کے ذریعے کوئی جزوی تبدیلی پیدا کر کے ایک نئی مخلوق کی صورت عطا کر دیتا ہے۔ چنانچہ اولاً تو ”خلق“ اصلاً نام ہی اس کا ہے کہ کسی پہلے سے موجود شے سے کوئی دوسری شے پیدا کر دی جائے! (بمقابلہ ابداع و ایجاد — جو عدم محض سے وجود میں آنے سے عبارت ہے!) اور ثانیاً قرآن کی شہادتوں اور قرآن حکیم کے اشارات سے اسی جانب رہنمائی ملتی ہے کہ پوری کائنات کی تخلیق کی طرح حیات ارضی کے ارتقاء نے بھی یہی صورت اختیار کی ہے!

لہذا اس معاملے میں ان لوگوں کیلئے تو کوئی مشکل ہے ہی نہیں جو ایک مُبدع و موجد اور ”الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ“ ہستی پر یقین رکھتے ہیں — ان کے نزدیک تو یہ سارا سفر تنزل و ارتقاء اسی کی مشیت و تدبیر اور اسی کے حکم

۱ ”اور اس نے ہر چیز کو پیدا کیا“ پھر اس کی ایک تقدیر مقرر کی۔“

۲ ”جس نے پیدا کیا اور تناسب قائم کیا۔ اور جس نے اندازہ ٹھہرایا“ پھر راہ معین کی۔“

وَأَمْرًا ظَوْرًا ہے۔ جیسے کہ حکیم اسلام مولانا رومؒ نے نہایت سادہ الفاظ میں فرمایا کہ ط "می کشد آں خالقے کہ دانیش!" — یعنی یہ سارے فاصلے اُسی خالق نے طے کرائے ہیں جس سے تم بخوبی واقف ہو! (اس لئے کہ ان کے مخاطبِ اولین وہ مسلمان ہی تھے جو خالقِ ارض و سموات پر ایمان رکھتے ہیں!)

البتہ وہ مادہ پرست جو اس مبدع و مُوجد، اور خالق و باری ہستی کو ذہن و خیال سے دُور رکھتے ہوئے اس عقدے کو حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ حیاتِ ارضی کی کمتر سے برتر اور کمتر سے بہتر کی طرف چھلانگ کس طور سے لگی اور اس کا "میکانزم" کیا تھا وہ شدید مشکل سے دوچار ہو گئے ہیں۔

چنانچہ ان کے سرخیل تو ہیں جناب ڈارون جنہوں نے اس کی خالص مادی اور انفعالی توجیہ کی ہے — یعنی یہ کہ ماحول میں پیدا ہونے والی تبدیلیوں سے ہم آہنگی (Adaptation) اختیار کرنے اور وسائلِ زندگی کی محدودیت کی بناء پر ان کے ضمن میں کشاکش اور "تَنَازُعُ لِلْبَقَاءِ" (Struggle for Existence) کے نتیجے میں حیوانات کے جسمانی اور عضویاتی نظام میں تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں، جو تدریجاً بڑھتے بڑھتے اور نسلِ بعدِ نسل وراثت میں منتقل ہوتے رہنے سے ایک بالکل نئی نوع کی صورت اختیار کر لیتی ہیں — نتیجتاً جو نوع اپنے ماحول سے زیادہ — زیادہ مطابقت پیدا کر لیتی ہے وہی پھلتی اور پھیلتی ہے — باقی انواع یا تو نابود ہو جاتی ہیں — یا عملِ ارتقاء کی نچلی منزلوں پر "مقیم" ہو جاتی ہیں! — ڈارون کے اس نظریے کے تسلیم کئے جانے میں اہم ترین مانع اور کانٹے کی رکاوٹ تو یہ رہی کہ حیوانات ماحول کے زیرِ اثر جو نئے اوصاف (Acquired Characters) اختیار کرتے ہیں، ان کے تناسل و توارث کے ذریعے اگلی نسل کو منتقل ہونے کا کوئی ثبوت فراہم نہیں کیا جاسکا — اس کے باوجود محض اس لئے کہ نفسِ ارتقاء کا معاملہ

بدیہیات کے زمرے میں داخل ہو گیا تھا، ڈارون کی اس خالص مادی اور انفعالی توجیہ کو فکرِ انسانی کے تمام دائروں میں اثر و نفوذ حاصل ہو گیا — جس کا نمایاں ترین مظہر یہ ہے کہ فلسفہٴ مادیت کو منطقی انتہا تک پہنچانے والا مفکر کارل مارکس اپنی شرعہٴ آفاق تصنیف ”داس کیپٹال“ کو ڈارون ہی کے نام سے معنون کرنا چاہتا تھا۔ (اس ضمن میں اس واقعے کا ذکر دلچسپی کا موجب ہو گا کہ مارکس کے دوست اور رفیق کار انجلز نے اسے خط لکھا تھا کہ میں آج کل چارلس ڈارون کی کتاب پڑھ رہا ہوں، جو بہت ہی عمدہ ہے۔ اس لئے کہ اس نے مذہب کے آخری قلعے کو بھی مسمار کر دیا ہے، جس پر خود کارل مارکس نے بھی ڈارون کی کتاب کا مطالعہ کیا اور انجلز کے خیال سے اتفاق کا اظہار کیا۔)

تاہم جیسے کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے ہے خالص علم الحیات (Biology) کے میدان میں ڈارون کی یہ توجیہ ارتقاء غیر مقبول ہوتے ہوئے تقریباً دم توڑ چکی ہے — اور اس کی بجائے لامارک اور اس کے ہم خیال لوگوں کا یہ مثبت نظریہ زیادہ قبولیت حاصل کر رہا ہے کہ ارتقاء کے اس سفر کا اصل محرک ماحول میں پیدا ہونے والی تبدیلیوں کا انفعالی ردِ عمل نہیں بلکہ ”حیات“ میں یہ داخلی اور اساسی طور پر موجود (inherent) جذبہ اور ولولہ ہے کہ وہ از خود طے ”ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں!“ کے انداز میں آگے سے آگے بڑھتی چلی جائے۔ گویا یہ تبدیلی اندھے بہرے مادے کے محض حادثاتی عمل اور ردِ عمل کا مظہر نہیں بلکہ اس کی پشت پر ایک واضح مقصدیت کار فرما ہے! (چنانچہ اس نظریے کو علم الحیات کی اصطلاح میں Purposeful and Teleological Evolution کہا جاتا ہے، جو حقیقتِ نفس الامری سے نسبتاً قریب تر ہے!)

مزید برآں علم الحیات (Biology) کے میدان میں ڈارون کے بعد کے

اکتشافات سے یہ حتمی طور پر معلوم ہو چکا ہے کہ یہ تبدیلی اصلاً Genes یا DNA میں واقع ہوتی ہے — گویا جس طرح حضرت عیسیٰ ﷺ کی پیدائش میں والد کی جانب سے آنے والے Sperm کی کمی کو پورا کیا تھا اللہ تعالیٰ کے ایک کلمہ ”کن“ نے، اسی طرح ذاتِ خالق و باری و مصور نے جب چاہا اپنے امر کن سے حیوانات کی کسی بھی نوع کے Genes میں تبدیلی پیدا کر دی — اور اس طرح ایک نئی نوع وجود میں آگئی! —

اور یہ سلسلہ ایک طویل مدت تک جاری رہا۔ یہاں تک کہ ”حیوانِ انسان“ یعنی بیالوجی کی اصطلاح میں ”Homo Sapiens“ کے ظہور پر سفر ارتقاء کا یہ دوسرا مرحلہ تکمیل کو پہنچ کر اختتام پذیر ہو گیا!

تکمیلِ تخلیقِ آدمؑ — اور — عطاءِ خلعتِ خلافت

اور اس کے بعد پیش آیا تاریخِ کائنات کا عظیم ترین واقعہ یعنی ”حیوانِ انسان“ میں نفخِ روحِ آدمؑ — اور اس طرح وجود میں آنے والے حضرت آدمؑ کو تفویضِ خلافتِ ارضی — اور اس کے لئے منعقد ہونے والے ”جشنِ تاجپوشی“ میں جملہ کارکنانِ قضا و قدر یعنی تمام ملائکہ کا بطورِ اظہارِ تسلیم و انقیاد ”خليفة الله“ کے سامنے سجدہ — لیکن ملائکہ کے طبقہ اسفل میں شامل جن عزازیل کا اعلانِ بغاوت، اور نتیجتاً راندہ درگاہِ رب قرار پانا۔ اور شیطان اور ابلیس کے خطابات سے نوازا جانا!

حکمت و فلسفہ قرآن کی رو سے قصہٴ آدم و ابلیس کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ یہ قرآن میں سات مرتبہ وارد ہوا — چھ بار مکی سورتوں میں، اور ایک مرتبہ مدنی سورت (البقرہ) میں۔ پھر مکی سورتوں کے چھ مقامات جن میں یہ واقعہ مذکور ہے مصحف میں حیرت انگیز توازن و تقابل (SYMMETRY)

کے ساتھ واقع ہوئے ہیں۔ چنانچہ مصحف کے عین وسط میں واقع ہیں فلسفہ و حکمت قرآنی کے دو عظیم ترین خزانے یعنی سورہ بنی اسرائیل اور سورہ کہف — جو سورتوں کے نہایت حسین و جمیل اور حد درجہ متوازن و متناسب جوڑے کی صورت میں ہیں، اس لئے کہ دونوں ہی بارہ بارہ رکوعوں پر مشتمل ہیں اور آیات کی تعداد بھی تقریباً برابر (۱۱۱ اور ۱۱۰) ہے! — اور مزید حیرت انگیز امر یہ ہے کہ ان دونوں ہی کے ساتویں رکوع کے آغاز میں مذکور ہے یہ قصہ آدم و ابلیس! — پھر سورہ بنی اسرائیل سے پیچھے کی جانب مڑیے تو ایک سورہ (النحل) چھوڑ کر سورہ الحجر میں یہ واقعہ مذکور ہے تو دوسری جانب سورہ کہف سے آگے بڑھئے تو ایک سورت (مریم) چھوڑ کر سورہ طہ میں اس کا ذکر موجود ہے — پھر سورہ الحجر سے چھ پارے پیچھے ہٹئے تو سورہ الاعراف میں، اور ادھر سورہ طہ سے سات پارے آگے جائیں تو سورہ ص میں یہ قصہ وارد ہوا ہے — اور پھر ترتیب نزول کے اعتبار سے ان سب کے بعد یہ قصہ سورہ البقرہ میں ایک اہم اضافے یعنی آدم علیہ السلام کو خلافت ارضی عطا کئے جانے کے ذکر کے ساتھ مذکور ہے — اس لئے کہ اس سورہ مبارکہ کے نزول کے وقت سرزمین یشرب میں عرصہ دراز کے بعد از سرنو ”خلافت الہی“ کے بالفعل قیام کا آغاز ہو گیا تھا!

متذکرہ بالا سات مقامات میں سے دو مقامات (سورہ الحجر اور سورہ ص) اس اعتبار سے نہایت اہم ہیں کہ ان میں حضرت آدمؑ کے ذکر سے قبل ”بشر“ کی تخلیق اور تسویہ کا ذکر ہے۔ چنانچہ سورہ ص میں فرمایا گیا: ﴿إِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ خَالِقٌ بَشَرًا مِّنْ طِیْنٍ ۝۱﴾ (آیت ۱۷) اور سورہ الحجر میں فرمایا گیا: ﴿وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ خَالِقٌ بَشَرًا مِّنْ صَلٰصَالٍ مِّنْ حَمَإٍ

۱۔ ”جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا: میں مٹی سے ایک بشر بنانے والا ہوں۔“

مَسْنُونٍ ۝ ﴿۱﴾ (آیت ۲۸) — گویا ان دونوں مقامات پر اولاً ط ”ہر دو عالم خاک شد تا بست نقشِ آدمی!“ کے مصداق انسان (بشر) کی تخلیق کے لئے قرآن میں جو چھ اصطلاحات وارد ہوئی ہیں یعنی تُراب، پھَرطین، پھَرطینِ لَازِب، پھر حَمًا مَسْنُونٍ، پھر صَلْصَالٍ مِّنْ حَمًا مَسْنُونٍ، اور بالآخر صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ — ان میں سے سورہ ص میں ابتداء سے دوسری اصطلاح کا ذکر ہے — اور سورہ الحجر میں آخری سے پہلی والی اصطلاح مذکور ہے! — اور ثانیاً اس کے بعد ان دونوں سورتوں میں دو دو آیات بعینہ ایک جیسے الفاظ میں وارد ہوئی ہیں، یعنی : ﴿فَإِذَا سَوَّيْتُهُ وَنَفَخْتُ فِيهِ مِنْ رُّوحِي فَقَعُوا لَهُ سَاجِدِينَ ۝ فَسَجَدَ الْمَلَائِكَةُ كُلُّهُمْ أَجْمَعُونَ ۝﴾ ۲ (الحجر ۲۹، ۳۰ اور ص : ۷۲، ۷۳) — ان دونوں مقامات پر ”تسویۃ“ کی اصطلاح میں سمولیا گیا ہے پورا عمل ارتقاء حیاتِ ارضی، جو منبج ہوا ”حیوانِ انسان“ کے ظہور پر، اس کے بعد ذکر ہوا اُس حیوانِ انسان میں رُوحِ آدم کے پھونکے جانے کا — جو اُس وقت تک مخزنِ ارواح میں محو خواب تھی — اور جس کے عز و شرف کے اظہار کے لئے اللہ تعالیٰ نے اسے اپنی ذات کی جانب منسوب کیا — یعنی ”مِنْ رُّوحِي“ — اور اس طرح وجود میں آئے حضرت آدم ﷺ جن کو سجدہ کرنے کا حکم جملہ ملائکہ کو دے دیا گیا! جنہوں نے بلا حیل و حجت اور بغیر پس و پیش آنِ واحد میں تعمیلِ حکم میں سر جھکا دیئے، اس لئے کہ ان کی شان ہی یہ ہے کہ ﴿لَا يَعْصُونَ اللَّهَ مَا أَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ ۝﴾ ۳ (التحریم : ۶) —

۱ ”اور جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا : میں سڑی ہوئی مٹی کے سوکھے گارے سے ایک بشر پیدا کر رہا ہوں۔“

۲ ”پھر جب میں اسے پوری طرح بنا چکوں اور اس میں اپنی روح میں سے پھونک دوں تو تم سب اس کے آگے سجدے میں گر جانا!“

۳ ”وہ اللہ کے حکم کی نافرمانی نہیں کرتے اور جو حکم بھی انہیں دیا جاتا ہے اسے بجالاتے ہیں۔“

جیسے کہ اس سے قبل عرض کیا جا چکا ہے ملائکہ کا یہ سجدہ علامت یا symbol تھا ان کے حضرت آدم کو ”خَلِيفَةُ اللَّهِ“ تسلیم کر کے ان کے سامنے اطاعت و انقیاد کے اقرار کا — اور یہ گویا ”جشن تاجپوشی“ تھا جو حضرت آدم ﷺ کو خلعتِ خلافت عطا ہونے پر منعقد کیا گیا۔

ابلیس کا اعلانِ بغاوت اور اس کا سبب

قرآن مجید کے متذکرہ بالا ساتوں مقامات پر جملہ ملائکہ کے حضرت آدمؑ کو سجدہ کر لینے کے ذکر کے معاً بعد الفاظ وارد ہوئے ہیں ﴿إِلَّا ابْلِيسَ﴾ اور پھر مختلف مقامات پر مختلف الفاظ ملتے ہیں، جیسے سورۃ البقرہ میں : ﴿أَبَىٰ وَاسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكَافِرِينَ﴾ — سورۃ الاعراف میں : ﴿لَمْ يَكُنْ مِنَ السَّاجِدِينَ﴾ — سورۃ الحجر میں : ﴿أَبَىٰ أَنْ يَكُونَ مَعَ السَّاجِدِينَ﴾ — سورۃ بنی اسرائیل میں : ﴿قَالَ أَسْجُدْ لِمَنْ خَلَقْتَ طِينًا﴾ — سورۃ کہف میں : ﴿كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ أَمْرِ رَبِّهِ﴾ — سورۃ طہ میں صرف : ﴿أَبَى﴾ اور سورۃ ص میں ﴿اسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكَافِرِينَ﴾ (گویا سورۃ البقرہ میں سورۃ طہ اور سورۃ ص میں وارد شدہ الفاظ جمع کر دیئے گئے ہیں!)

یہاں اس سوال کے دو جواب ممکن ہیں کہ جب حکم سجدہ فرشتوں کو دیا گیا

۱۔ ”اس نے انکار کیا“ وہ اپنی بڑائی کے گھمنڈ میں پڑ گیا اور نافرمانوں میں شامل ہو گیا۔“

۲۔ ”وہ سجدہ کرنے والوں میں شامل نہ ہوا۔“

۳۔ ”اس نے سجدہ کرنے والوں کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔“

۴۔ ”اس نے کہا : کیا میں اس کو سجدہ کروں جسے تو نے مٹی سے بنایا ہے؟“

۵۔ ”وہ جنوں میں سے تھا اس لئے اپنے رب کے حکم کی اطاعت سے نکل گیا۔“

۶۔ ”اس نے اپنی بڑائی کا گھمنڈ کیا اور وہ کافروں میں سے ہو گیا۔“

تو عزازیل نامی جن اس کا مخاطب کیسے قرار پایا؟ — یعنی ایک یہ کہ حکیم الہی ﴿اسْجُدُوا لِآدَمَ﴾ ۱ فرشتوں اور جنات دونوں کو تھا لیکن ذکر بر سبیل تغلیب صرف فرشتوں کا کیا گیا — اور دوسرا یہ کہ جیسے کہ پہلے بھی عرض کیا جا چکا ہے، عزازیل اپنے علم اور زہد و طاعت کی بنا پر ملائکہ کے طبقہ اسفل میں شامل ہو گیا تھا — واللہ اعلم!

البتہ اصل لائق توجہ امر یہ ہے کہ خود ابلیس نے اپنے انکار و بغاوت کا سبب کیا بیان کیا — سورۃ البقرہ میں اس کا کوئی ذکر نہیں ہے — سورۃ الاعراف میں اس کے یہ الفاظ نقل کئے گئے ہیں کہ: ﴿أَنَا خَيْرٌ مِنْهُ ۚ خَلَقْتَنِي مِنْ نَارٍ وَخَلَقْتَهُ مِنْ طِينٍ ۝﴾ ۲ (آیت ۱۲)۔ سورۃ الحجر میں یہ قول وارد ہوا: ﴿قَالَ لَمْ أَكُنْ لَأَسْجُدَ لِبَشَرٍ خَلَقْتَهُ مِنْ صَلْصَالٍ مِنْ حَمَإٍ مَسْنُونٍ ۝﴾ ۳ (آیت ۳۲) — سورۃ بنی اسرائیل میں وارد شدہ الفاظ پہلے ہی درج کئے جا چکے ہیں یعنی: ﴿قَالَ أَسْجُدْ لِمَنْ خَلَقْتَ طِينًا ۝﴾ — سورۃ کہف اور سورۃ طہ میں بھی اس کا کوئی قول مذکور نہیں — البتہ سورۃ ص میں دوبارہ بعینہ وہی الفاظ وارد ہوئے ہیں جو سورۃ الاعراف میں ہوئے تھے یعنی: ﴿أَنَا خَيْرٌ مِنْهُ ۚ خَلَقْتَنِي مِنْ نَارٍ وَخَلَقْتَهُ مِنْ طِينٍ ۝﴾ (آیت ۱۲)۔

اس پوری تفصیل کے بیان سے غرض یہ ہے کہ یہ حقیقت بالکل مبرہن ہو جائے کہ ابلیس کی بغاوت کا اصل سبب یہ تھا کہ اس کے سامنے حضرت آدمؑ کی شخصیت کا صرف وہ حیوانی پہلو تھا جو خاکی الاصل ہونے کے ناطے مرتبہ و مقام

۱ ”سجدہ کرو آدم کو۔“

۲ ”میں اس سے بہتر ہوں، تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا ہے اور اسے مٹی سے۔“

۳ ”اُس نے کہا: میرا یہ کام نہیں کہ میں اس بشر کو سجدہ کروں جسے تو نے سڑی ہوئی مٹی کے سوکھے گارے سے پیدا کیا ہے۔“

کے اعتبار سے ناری الاصل جنات کے مقابلے میں کمتر تھا — اور یہ اس لئے کہ چونکہ ابلیس کا تعلق بھی حیوانِ انسان کی مانند عالمِ خلق سے تھا لہذا حیوانِ انسان سے تو وہ بخوبی واقف تھا — لیکن روحِ آدمؑ کا تعلق چونکہ عالمِ امر اور اس کے بھی طبقہ اعلیٰ سے تھا جس تک جنات کے علم و ادراک کی رسائی ہی نہیں تھی لہذا وہ اس سے ناواقف اور ”محبوبِ محض“ تھا۔ جبکہ — آدمؑ کے عز و شرف کی اصل بنیاد اور انہیں خلافتِ ارضی کا اہل اور مسجود ملائک بنانے والی اصل شے ہی وہ روحِ ربانی تھی جو ان کے حیوانی جسد میں پھونکی گئی — اور جسے خالق کائنات نے اپنی ذات کی جانب منسوب کیا! ﴿بُفِّحُوا لَهُ﴾ (فَإِذَا سَوَّيْتُهُ وَنَفَخْتُ فِيهِ مِنْ رُوحِي فَقَعُوا لَهُ سَاجِدِينَ ٥) ۱۔ (الحجر: ۲۹ اور ص: ۷۲) — گویا ابلیس کی گمراہی اور بغاوت کا اصل سبب یہ تھا کہ آدمؑ کی مرکب شخصیت، جو دو اجزاء کے جمع ہونے سے وجود میں آئی تھی، یعنی ایک حیوانی وجود جس کا تعلق ”عالمِ خلق“ سے تھا، اور دوسرے روحانی وجود جس کا تعلق ”عالمِ امر“ سے تھا، ان میں سے حیوانی وجود تو اس کے سامنے تھا، لیکن روحانی وجود سے وہ ”محبوب“ تھا! (اور غالباً یہی حقیقت ہے جس کی جانب اشارہ ہوا ہے اس فرمانِ الہی میں کہ ﴿خَلَقْنَاهُ بِيَدَيَّ﴾ میں نے اس آدمؑ کو اپنے ”دونوں ہاتھوں“ سے بنایا ہے — اور جس کی سادہ ترین تعبیر شیخ سعدیؒ کے اس شعر میں ہے کہ: ص

”آدمی زادہ طرفہ معجون است از فرشتہ سرشتہ وز حیواں“
 اور بعینہ یہی سبب ہے عہدِ حاضر کی اس عالمی ضلالت و شیطنیت کا جو مادہ پرستانہ نقطہ نظر اور اندازِ فکر کے غلبہ و استیلاء کی بنا پر پورے عالمِ انسانی کو اپنی

۱۔ ”پھر جب میں اسے پورا بنا چکوں اور اس میں اپنی روح میں سے پھونک دوں تو تم سب اس کے آگے سجدے میں گر جانا۔“

لیٹ میں لے چکی ہے — اور جسے دو آتشہ یا سہ آتشہ ہی نہیں صد آتشہ کر دیا ہے نظریہ ارتقاء کی جملہ سائنسی تعبیرات نے، جن کا حاصل یہ ہے کہ انسان بس نسبتاً زیادہ ارتقاء یافتہ حیوان ہے اور اس کے سوا کچھ نہیں! — اس لئے کہ ٹھیک عز ازیل ہی کے مانند علومِ طبیعی (PHYSICAL SCIENCES) بھی رُوح اور روحانیت سے محجوب ہونے کے باعث انسان کے صرف حیوانی وجود ہی سے بحث کر سکتے ہیں، رہے ”عالمِ امر“ کے معاملات یا بالفاظِ دیگر ”مابعد الطبیعیات“ تو وہ ان کے دائرہ تحقیق و تفتیش سے خارج اور ماوراء ہیں!

بہر حال، اسی ”یک رخنہ“ علم نے اُس ”یک رخنہ“ اور خالص مادہ پرستانہ فکر یعنی (SCIENTISM) کو جنم دیا — جس سے موجودہ ”یک چشمی“ و جالی تہذیب وجود میں آئی ہے، جو خالص مادہ پرستانہ نقطہ نظر پر مبنی اور رُوح اور روحانیت سے بیگانہ و نابلد محض ہے — اور جو آج نوعِ انسانی کی عظیم اکثریت میں اس درجہ گہرائی اور گیرائی کے ساتھ نفوذ کر چکی ہے، کہ مشرق و مغرب کے عوام الناس ہی نہیں، عمد حاضر کے بیشتر مسلم سکالر اور دانشور حتیٰ کہ داعیانِ تحریکِ اسلامی بھی ”رُوح“ کے آزاد اور جداگانہ تشخص و وجود سے منکر ہیں — اور اسے صرف حیات یا زندگی یا ”جان“ کے مترادف خیال کرتے ہیں۔ — فواحسرتاویا اسفا!!

ابلیس کی انسان دشمنی، اور معرکہِ خیر و شر

قرآن حکیم میں سات مقامات پر دہرائے جانے والے قصہ آدم و ابلیس کا آخری حصہ اس اعتبار سے بہت اہمیت کا حامل ہے کہ اس سے عالمِ انسانیت میں خیر و شر اور حق و باطل کے مابین جو کشاکش — ”ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز۔ چراغِ مصطفویٰ سے شرارِ بولہبی!“ کے انداز میں جاری ہے، اس کے

ایک اہم عامل کی نشاندہی ہوتی ہے! یعنی ابلیس لعین کی آدمؑ اور ان کی ذریت سے بغض و عداوت — اور اس کی بنا پر انسانوں کے اغوا اور اضلال میں ایک طاقتور غیر مرئی قوت کی کار فرمائی۔

ابلیس لعین نے اپنی بغاوت اور سرکشی پر راندہ درگاہ حق ہو جانے کے بعد اللہ تعالیٰ سے اپنی عمر کے قیامت تک دراز کئے جانے کی درخواست کی، جو منظور ہو گئی۔ تب اس نے نہایت متکبرانہ اور متحدیانہ انداز میں آدمؑ اور اس کی ذریت کے خلاف اپنی عداوت کا برملا اظہار اور دائمی جنگ کا کھلا اعلان کر دیا۔ چنانچہ سات مقامات میں سے تین پر تو اس بغض و عداوت کا ذکر اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہوا ہے، جیسے : (۱) سورۃ البقرہ میں : ﴿وَقُلْنَا اهْبِطُوا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ﴾ ۱ (آیت ۳۶) کے الفاظ میں، (۲) سورۃ طہ میں ابتداءً : ﴿فَقُلْنَا يَا آدَمُ إِنَّ هَذَا عَدُوٌّ لَّكَ وَلِزَوْجِكَ...﴾ ۲ (آیت ۱۱۷) کے الفاظ میں اور بعد ازاں بالکل سورۃ البقرہ میں وارد شدہ الفاظ سے مماثل الفاظ میں یعنی ﴿قَالَ اهْبِطَا مِنْهَا جَمِيعًا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ﴾ ۳ (آیت ۱۲۳) — اور (۳) سورۃ کہف میں ذریت آدمؑ سے اللہ تعالیٰ کے شکوے کے انداز میں کہ : ﴿أَفَتَتَّخِذُونَهُ وَذُرِّيَّتَهُ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِي وَهُمْ لَكُمْ عَدُوٌّ بِئْسَ لِلظَّالِمِينَ بَدَلًا﴾ ۴ (آیت ۵۰)۔ البتہ بقیہ مقامات پر شیطان لعین کی جانب سے بھرپور چیلنج کے انداز میں کھلی جنگ کا اعلان سامنے آتا ہے، جیسے :

- ۱ "اور ہم نے حکم دیا کہ اب تم سب یہاں سے اتر جاؤ، تم ایک دوسرے کے دشمن ہو۔"
- ۲ "چنانچہ ہم نے آدمؑ سے کہا : دیکھو، یہ تمہارا اور تمہاری بیوی کا دشمن ہے۔"
- ۳ "فرمایا : تم دونوں (فریق، یعنی انسان اور شیطان) یہاں سے اتر جاؤ، تم ایک دوسرے کے دشمن ہو گے۔"
- ۴ "اب کیا تم مجھے چھوڑ کر اس کو اور اس کی ذریت کو اپنا سرپرست بناتے ہو حالانکہ وہ تمہارے دشمن ہیں؟ بڑا ہی بربادل ہے جسے ظالم لوگ اختیار کر رہے ہیں۔"

(۱) سورۃ بنی اسرائیل میں : ﴿لَا حَتِّكَ ذُرِّيَّتُهُ إِلَّا قَلِيلًا ۝﴾ ^۱ (آیت ۶۲) کے الفاظ میں (۲) سورۃ ص میں ﴿قَالَ فَبِعِزَّتِكَ لَا غَوِيَّتَهُمْ أَجْمَعِينَ ۝ إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمْ الْمُخْلَصِينَ ۝﴾ ^۲ (آیات ۸۲، ۸۳) کے الفاظ میں اور (۳) سورۃ الحجر میں : ﴿قَالَ رَبِّ بِمَا أَغْوَيْتَنِي لَأُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِي الْأَرْضِ وَلَا غَوِيَّتَهُمْ أَجْمَعِينَ ۝ إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمْ الْمُخْلَصِينَ ۝﴾ ^۳ (آیات ۳۹، ۴۰) کے الفاظ میں — اور سب سے زیادہ مفصل سورۃ الاعراف میں : ﴿قَالَ فَبِمَا أَغْوَيْتَنِي لَأَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيمَ ۝ ثُمَّ لَأَنْتَهُنَّ مِنْ بَيْنِ أَيْدِيهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ أَيْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَائِلِهِمْ ^ط وَلَا تَجِدُ أَكْثَرَهُمْ شَاكِرِينَ ۝﴾ ^۴ (آیات ۱۶، ۱۷) کے الفاظ میں !

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ انسان کی شخصیت کے داخلی محاذ پر توجہ معرکہ خیز و شریر ہوتا ہے اس کی اساس اس کے اپنے وجود کے دو اجزائے ترکیبی ہیں، یعنی ایک جانب اس کا وجود حیوانی ہے جو اپنے اُن خالص جبلّی تقاضوں (INSTINCTS) اور شہوانی امنگوں (LUSTS) کے زیر اثر اسے شر اور سوء کی جانب کھینچتا ہے جنہیں صرف اپنی تسکین (GRATIFICATION)

۱ "میں اس کی پوری نسل کی بچہ بنی کر ڈالوں گا" بس تھوڑے ہی لوگ مجھ سے بچ سکیں گے۔"

۲ "اس نے کہا: تیری عزت کی قسم، میں اُن سب لوگوں کو بہکا کر رہوں گا، بجز تیرے ان بندوں کے جنہیں تو نے ان میں سے خالص کر لیا ہے۔"

۳ "وہ بولا: میرے رب، جیسا تو نے مجھے بہکایا اسی طرح اب میں زمین میں ان کے لئے دلفریبیاں پیدا کر کے ان سب کو بہکا دوں گا، سوائے تیرے ان بندوں کے جنہیں تو نے ان میں سے خالص کر لیا ہو۔"

۴ "بولا: اچھا تو جس طرح تو نے مجھے گمراہی میں مبتلا کیا ہے میں بھی اب تیری سیدھی راہ پر ان انسانوں کی گمراہی میں لگا رہوں گا۔ پھر میں آگے اور پیچھے، دائیں اور بائیں، ہر طرف سے ان کو گھیروں گا، اور تو ان میں سے اکثر کو شکر گزار نہ پائے گا۔"

ہی سے غرض ہوتی ہے، قطع نظر اس سے کہ اس کے ذرائع جائز ہوں یا ناجائز،
 ﴿إِنَّ النَّفْسَ لَأَمَّارَةٌ بِالشُّوْءِ....﴾^۱ (یوسف : ۵۳) تو دوسری
 جانب وہ روح ہے جو اسے ط ”ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر۔ کعبہ
 مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے!“ کے انداز میں برائی سے روکتی اور اس پر
 ملامت کرتی ہے (چنانچہ اس حال میں نَفْسٌ لَّوَّامَةٌ کہلاتی ہے) اور اس کے
 برعکس خیر کی جانب راغب کرتی ہے — لیکن خارجی محاذ پر جو اصل ہنگامہ
 کشاکش اور گرمی ستیز خیر و شر کے مابین انسانی معاشرے میں برپا ہے، اس کے
 ضمن میں دو دو داعیانِ خیر ہیں تو دو دو ہی داعیانِ شر بھی موجود ہیں —
 ایک ایک مرئی اور محسوس و مشہود یعنی خود انسانوں ہی میں سے داعیانِ اِلٰی الخیر
 اور داعیانِ اِلٰی الشر، اور ایک ایک غیر مرئی، یعنی ایک جانب ملائکہ جو نیکو کاروں
 کی تقویت کے موجب بنتے ہیں اور دوسری جانب ابلیس لعین اور اس کی ذریت
 صلیبی و معنوی جو شیاطین کا رول اختیار کر کے انسانوں کی گمراہی میں مؤثر کردار
 ادا کرتے ہیں۔

چنانچہ ایک حدیثِ نبویؐ سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے چونکہ انسان
 کی حیاتِ دنیوی کو اس کے لئے ایک امتحانی وقفہ قرار دیا ہے — اور اسی لئے
 اسے اس رزم گاہ خیر و شر میں ط ”درمیانِ قعرِ دریا تختہ بدم کردہ!“ کے
 انداز میں داخل کر دیا ہے، لہذا ہر انسان کے ساتھ ایک شیطان کو بھی لگا دیا ہے
 تاکہ انسان اس کی تمام تر تحریص و ترغیب شر اور جملہ وسوسہ اندازیوں کے علی
 الرغم توحید نظری و عملی کی صراطِ مستقیم پر ثابت قدم رہ کر اپنے شرفِ انسانیت کا
 ثبوت فراہم کرے!

ابلیس لعین اور جنات میں سے اس کی ذریتِ صلیبی و معنوی کو انسانوں کے

۱۔ ”نفس تو بدی پر اکساتا ہی ہے۔“

مقابلے میں ایک سہولت تو یہ حاصل ہے کہ وہ غیر مرئی ہونے کی بنا پر انسان پر وہاں سے حملہ کرتے ہیں جہاں سے انسان انہیں نہیں دیکھ سکتے، (نفحوائے ﴿ اِنَّهُ يَرْكُمُ هُوَ وَقَبِيلُهُ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ ط ﴾^۱ (الاعراف : ۲۷) — اور دوسری وہ جو حدیث نبویؐ میں ان الفاظ میں وارد ہوئی ہے کہ : ((اِنَّ الشَّيْطَانَ يَجْرِي مِنَ الْاِنْسَانِ مَجْرًى الدَّمِ)) یعنی شیطان انسان کے وجود میں خون کے مانند گردش کرتا ہے۔ اب خواہ اسے ایک استعارے پر محمول کر لیا جائے یعنی اس سے یہ مراد لی جائے کہ چونکہ ان شیاطین جن کو انسانوں کے سینوں میں وسوسہ اندازی کی صلاحیت حاصل ہے، (نفحوائے ﴿ الَّذِي يُوسْوِسُ فِي صُدُورِ النَّاسِ ۝ ﴾^۲ الناس : ۵) جس سے وہ انسانی شہوات میں اشتعال پیدا کرتے ہیں جس کا اثر انسان کے پورے وجود پر مترتب ہوتا ہے، تو گویا وہ اس طرح انسان کے پورے وجود میں سرایت کر جاتے ہیں، خواہ ظاہری لفظی معنی پر محمول کر لیا جائے نتیجے کے اعتبار سے کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ (واضح رہے کہ اپنے مادہ تخلیق یعنی آگ کے لطیف ہونے کی بنا پر جیسے جنات مختلف صورتیں اختیار کر سکتے ہیں، اسی طرح ان کا کسی دوسرے ٹھوس جسم میں حلول یا سرایت کر جانا بھی بعید از قیاس نہیں ہے۔)

اس کے مقابل ہے وہ تحفظ اور ضمانت جو اللہ تعالیٰ نے ان شیاطین کے اثر و نفوذ کے خلاف انسانوں کو عطا کی ہے۔ یعنی جو لوگ اخلاص کے ساتھ اللہ کے بندے بن جائیں ان پر شیاطین کا کوئی داؤ یا وار کار گر نہیں ہو سکتا۔ بلکہ انسانوں میں سے صرف وہ لوگ ان کے ہتھے چڑھتے ہیں جو خود اپنی داخلی شخصیت کے محاذ پر رُوحِ ربانی کی بجائے نفسِ امارہ کی اطاعت و اتباع کی روش اختیار کر چکے

۱ "وہ اور اس کے ساتھی ہمیں ایسی جگہ سے دیکھتے ہیں جہاں سے تم انہیں نہیں دیکھ سکتے۔"

۲ "جو لوگوں کے دلوں میں وسوسے ڈالتا ہے۔"

ہوں۔ جیسے کہ سورۃ الحجر میں وضاحت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آغاز ہی میں ابلیس سے کہہ دیا تھا کہ : ﴿ اِنَّ عِبَادِيْ لَیْسَ لَكَ عَلَیْهِمْ سُلْطٰنٌ اِلَّا مَنْ اَتَّبَعَكَ مِنَ الْغٰوِیْنَ ۝ ﴾^۱ (آیت ۴۲) (سورۃ بنی اسرائیل کی آیت ۶۵ میں بھی یہی بات دہرائی گئی ہے۔) مزید برآں دوبارہ یہ بھی مذکور ہے کہ خود شیطان لعین نے بھی آدم علیہ السلام اور ان کی ذریت کے خلاف اعلان جنگ کرتے ہوئے تسلیم کر لیا تھا کہ اللہ کے ان مخلص بندوں پر جو اپنے اخلاص اللہ کے قبول کئے جانے کی بنا پر ”مخلص“ ہو جائیں گے، میرا کوئی داؤ یا وار کار گر نہیں ہو گا! (سورۃ ص : ۸۳ اور سورۃ الحجر : ۴۰)۔

نسل انسانی کی تاریخ میں جب تک انفرادیت کا پلڑا اجتماعیت پر بھاری رہا، خیر و شر کی یہ کشاکش بھی افراد ہی کے داخلی اور خارجی محاذوں پر جاری رہی — لیکن اب سے دو ڈھائی سو برس قبل جب ایک جانب انسان میں ”خود شناسی و خود نگری“ یعنی اپنے حقوق کا احساس پیدا ہوا، دوسری جانب مشینوں کی ایجاد نے صنعتی انقلاب کی داغ بیل ڈالی، اور تیسری طرف سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدانوں میں برق رفتار ترقی کا آغاز ہوا، جس کے نتیجے میں آج یہ صورت ہے کہ بقول علامہ اقبال — ”عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سمے جاتے ہیں۔ کہ یہ ٹوٹا ہوا تار امہ کامل نہ بن جائے!“ تو شیطان لعین نے بھی اپنی عظیم منصوبہ بندی کے ساتھ انسانوں ہی میں سے اپنے ہتھیائے ہوئے ایجنٹوں کے ذریعے سماجی، معاشی اور سیاسی تینوں میدانوں میں بے اعتدالی، بے راہ روی، اور فکری و عملی گمراہی کی صورت میں شر کا اثر و نفوذ حیاتِ اجتماعی کے دور دراز گوشوں تک پہنچا دیا — چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ اس وقت عالمِ انسانیت میں

۱۔ ”بے شک جو میرے حقیقی بندے ہیں ان پر تیرا بس نہ چلے گا“ لیکن (تیرا بس تو) صرف ان کے لئے ہوئے لوگوں پر ہی چلے گا جو تیری پیروی کریں۔“

ط ”کون سیاہی گھول رہا ہے وقت کے بتے دریا میں!“ کے مصداق جو شخصیت ہر نوع کے شر اور بدی کا زہر گھولنے کی سب سے بڑھ کر ذمہ دار ہے، وہ ابلیس ہی کی ہے، جسے مسیحی مذہبی لٹریچر میں لوسیفر (LUCIFER) کا نام دیا گیا ہے، اور جس کے ضمن میں حال ہی میں ولیم گائی کر (William Guy Kerr) نے اپنی تہلکہ آمیز تالیف ”PAWNS IN THE GAME“ میں یہ چشم کشا انکشافات کئے ہیں کہ اس نے انسانوں میں اپنی شیطنیت کا جال اولاً سوا دو سو برس قبل ”ORDER OF THE ILLUMINATI“ کے ذریعے پھیلایا، پھر FREE MASONRY اور اس طرح کی دوسری تنظیموں کے ذریعے آگے بڑھایا — اور بالآخر اب سے سو سال قبل ”ELDERS OF THE ZION“ کے حوالے کر دیا، جنہوں نے پہلے صرف ”WASP“ (WHITE ANGLO-SAXON PROTESTANTS) کے ذریعے اپنے مقاصد (اعلانِ بالفور ۱۹۱۷ء اور قیامِ اسرائیل ۱۹۴۸ء) حاصل کئے — لیکن اب پوری عیسائی دنیا کو اپنے فتراک کا نچیر بنا کر، نیو ورلڈ آرڈر کے عنوان سے پورے کرۂ ارضی پر بے حیائی و فحاشی، کفر و معصیت، اور شر و شیطنیت کے فیصلہ کن غلبے کی جانب پیش قدمی کر رہے ہیں — یہ دوسری بات ہے کہ ﴿وَمَكْرُؤًا وَّمَكْرَ اللّٰهِ ط وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمَكْرِيْنَ﴾^۱ (آل عمران : ۵۴) کے مصداق آخری فتح حق و صداقت ہی کی ہوگی۔ اور خیر و شر کے مابین ہونے والے اس آخری عظیم معرکے میں، جس کا نام بائبل میں ”ARMAGEDDON“ اور حدیث نبویؐ میں ”الْمَلْحَمَةُ الْعُظْمَى“ ہے، اور جس کی کوئی جھلک علامہ اقبال نے بھی دیکھ لی تھی جب انہوں نے فرمایا تھا کہ :

۱ ”اور انہوں نے خفیہ تدبیریں کیں تو (جواب میں) اللہ نے بھی اپنی خفیہ تدبیر کی، اور ایسی تدبیروں میں اللہ سب سے بڑھ کر ہے۔“

دُنیا کو ہے پھر معرکہ، رُوح و بدن پیش
 تہذیب نے پھر اپنے درندوں کو ابھارا
 اللہ کو پامردی، مؤمن پہ بھروسہ
 ابلیس کو یورپ کی مشینوں کا سہارا!
 اس میں بالآخر ﴿جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا﴾^۱
 (بنی اسرائیل : ۸۱) کے مصداق حق ہی غالب آئے گا!

رحمِ مادر میں نسل انسانی کے ہر فرد
 کے ضمن میں آغازِ حیات سے تاجپوشی آدم علیہ السلام تک
 کے طویل سفر کا خوردبینی اعادہ!

روئے ارضی پر حیات کا آغاز ایک ایسے خوردبینی جرثومے سے ہوا تھا جو
 صرف ایک خلیئے (CELL) پر مشتمل تھا۔ وہاں سے حیوانِ انسان
 (HOMO SAPIENS) تک کا سفر لکھو کھا برس میں طے ہوا — لیکن اس
 کے بعد نسلِ آدمؑ میں دوسرے حیوانات کی مانند جو سلسلہٴ توالد و تناسل جاری
 ہوا، اس کے ضمن میں دوسرے حیوانات سے بالکل جداگانہ اور ممتاز مرحلہ وہ آتا
 ہے جب رحمِ مادر میں پرورش پانے والے ابنِ آدم کے ہر جنین (EMBRYO)
 کی آدمؑ ہی کی طرح ”تاجپوشی“ ہوتی ہے، اور اس میں بھی اس کی وہ ”زوح“ لا
 کر پھونک دی جاتی ہے، جو اس وقت تک ”مخزنِ ارواح“ میں محو خواب تھی!
 قرآن حکیم میں علمِ جنین (EMBRYOLOGY) کے جو حوالے آئے ہیں،
 انہوں نے واقعہ یہ ہے کہ ماہرینِ علمِ جنین کو حیرت زدہ کر کے رکھ دیا ہے۔ اس
 سلسلے میں کینیڈا کے دو ماہرینِ علمِ جنین کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہو گا۔ چنانچہ

۱۔ ”حق آگیا اور باطل مٹ گیا، باطل تو یقیناً مٹنے ہی والا ہے۔“

یونیورسٹی آف ٹورنٹو سے تعلق رکھنے والے ڈاکٹر کتھ ایل مور، جن کی علم جنین پر دو تصانیف اکثر یونیورسٹیوں کے نصاب میں داخل ہیں، اور ڈاکٹر رابرٹ ایڈورڈز، جو لٹ ٹیوب بے بی کے ضمن میں شہرت یافتہ ہیں، دونوں نے نہایت متحیرانہ انداز میں گواہی دی ہے کہ قرآن حکیم نے رحم مادر میں انسانی جنین کی درجہ بدرجہ پرورش کی جو نقشہ کشی کی ہے وہ ان معلومات کے ساتھ حیرت ناک حد تک مطابقت رکھتی ہے جو خوردبین کی ایجاد کے بعد حال ہی میں انسان کے علم میں آئی ہیں۔

قرآن حکیم میں انسانی جنین کے مدارج ارتقاء کے حوالے یوں تو بہت سے مقامات پر آئے ہیں لیکن بلاشبہ ان کے ذرۂ سنام کی حیثیت حاصل ہے سورۃ المومنون کی آیات ۱۲ تا ۱۴ کو! جن میں تخلیق انسانی کو اولاً چار بڑے مراحل پر مشتمل قرار دیا گیا، جن کو کلمہ ”ثُمَّ“ کے ذریعے ایک دوسرے سے متمیز کیا گیا — پھر ان میں سے ایک یعنی تیسرے بڑے مرحلے کو چار چھوٹے مراحل میں تقسیم قرار دیا گیا، جنہیں ایک دوسرے سے متمیز کیا گیا صرف کلمہ ”فَ“ کے ذریعے۔ (گویا تین آیات میں تین ہی بار ”ثُمَّ“ وارد ہوا، اور تین ہی مرتبہ کلمہ ”فَ“۔) — اس تمہید کے بعد غور فرمائیے کہ پہلا بڑا مرحلہ بیان ہوا ان الفاظ میں کہ : ﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ سُلَالَةٍ مِّنْ طِينٍ ۝﴾ یعنی ”ہم نے پیدا کیا انسان کو گارے سے کشید شدہ خلاصے سے!“ پھر دوسرا بڑا مرحلہ بیان ہوا، یعنی : ﴿ثُمَّ جَعَلْنَاهُ نُطْفَةً فِي قَرَارٍ مَّكِينٍ ۝﴾ یعنی ”پھر ہم نے اسے ایک مضبوط جائے قرار (یعنی رحم مادر کی محکم فصیل یا دیوار) میں ایک بوند کی شکل میں رکھا!“ — پھر تیسرے بڑے مرحلے کی تفصیلات آئیں جو چار چھوٹے مراحل میں منقسم ہے، یعنی : ﴿ثُمَّ خَلَقْنَا النَّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظْمًا فَكَسَوْنَا الْعِظْمَ لَحْمًا ۝﴾ یعنی ”پھر ہم نے

اس بوند کو (جو تک کی مانند) لٹکی ہوئی شکل دے دی، پھر اس لٹکی ہوئی شے کو ہم نے گوشت کے ایک (چبائے ہوئے) لو تھڑے کی صورت دے دی، پھر ہم نے اس لو تھڑے میں ہڈیاں بنا دیں، اور پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھا دیا۔ — اور آخر میں پھر ”ثُمَّ“ کے فصل کے ذریعے چوتھے اور آخری بڑے مرحلے کا ذکر فرمایا گیا ان الفاظ مبارکہ میں کہ : ﴿ثُمَّ أَنْشَأْنَاهُ خَلْقًا آخَرَ ط﴾ یعنی ”اس کے بعد ہم نے اسے ایک اور ہی مخلوق بنا کھڑا کیا!“ — اور آخر میں فرمایا : ﴿فَتَبَارَكَ اللَّهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ ۝﴾ — ”پس بہت ہی بابرکت ہے اللہ جو بہترین تخلیق فرمانے والا ہے!“

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ ﴿ثُمَّ أَنْشَأْنَاهُ خَلْقًا آخَرَ ط﴾ سے مراد کیا ہے؟ اس کے جواب کے لئے اپنے تعقل و تفکریا تصور و تخیل کے گھوڑے دوڑانے کی بجائے رجوع کرنا چاہئے اس ہستی کی جانب جس کے فرائض منصبی میں یہ داخل ہے کہ قرآن کے اجمال کی تفصیل اور ابہام کی تبیین فرمائیں، ”فُحْوَائے : ﴿وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ....﴾“^۱ (النحل : ۴۴) — فَصَّلَى اللہ علیہ وعلی آلہ واصحابہ وسلم! چنانچہ بخاری اور مسلم دونوں نے روایت کیا حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے یہ فرمان نبویؐ کہ : ((إِنَّ أَحَدَكُمْ يُجْمَعُ خَلْقُهُ فِي بَطْنِ أُمِّهِ أَرْبَعِينَ لَيْلَةً نُّظْفَةُ ثُمَّ يَكُونُ عَلَقَةً مِثْلَ ذَلِكَ ثُمَّ يَكُونُ مُضْغَةً مِثْلَ ذَلِكَ ثُمَّ يُرْسَلُ إِلَيْهِ الْمَلَكُ فَيَنْفُخُ فِيهِ الرُّوحَ....)) یعنی ”تم میں سے ہر شخص کی تخلیق اس طور سے ہوتی ہے کہ وہ رحم مادر میں چالیس روز تک نطفہ کی صورت میں ہوتا ہے، پھر اتنی ہی مدت علقہ کی صورت میں، اور پھر اتنی ہی عرصہ مضغہ کی صورت میں، اور پھر فرشتے کو بھیجا جاتا

۱ ”اور (اے نبی!) یہ ذکر آپ پر نازل کیا گیا ہے، تاکہ آپ لوگوں کے سامنے اس تعلیم کی تشریح و توضیح کرتے جائیں جو ان کے لئے اتاری گئی ہے۔“

ہے جو اس میں ”روح“ پھونک دیتا ہے!“ — گویا یہ ہے ابنِ آدم کی وہ ”تاجپوشی“ جس کے بعد وہ حقیقتاً ”آدمی“ قرار پاتا ہے۔ جبکہ اس سے قبل وہ رحمِ مادر میں صرف ”حیوانِ انسان“ کے ارتقائی مراحل طے کر رہا تھا!

اب سوائے اپنے سر کو پیٹنے کے اور کیا کیا جاسکتا ہے اس پر کہ جدید علوم سے بے بہرہ اور علم الحیات (BIOLOGY) کی ابجد سے بھی ناواقف ”علماء“ ہی نہیں، اچھے بھلے جدید تعلیم سے آراستہ و پیراستہ انسان بھی یہاں ”روح“ سے مراد زندگی یا ”جان“ لے لیں! جبکہ علم الحیات کی ابجد سے واقف ہر بچہ بھی جانتا ہے کہ نہ صرف وہ نُظْفَةُ امْشَاجُ جو رحمِ مادر میں پرورش پاتا ہے، بلکہ والد کی جانب سے آنے والا جرثومہ (SPERM) اور والدہ کا بیضہ (OVUM) جن کے امتزاج سے وہ نُظْفَةُ امشاج وجود میں آتا ہے، دونوں ”حیات“ سے پوری طرح متصف ہوتے ہیں — بلکہ والد کی جانب سے آنے والا ”سپرم“ تو نہ صرف ”زندہ“ بلکہ بھرپور جوش و خروش کے ساتھ متحرک بھی ہوتا ہے!

نوعِ انسانی کا ذہنی اور عمرانی ارتقاء

ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم کے جس مقالے کا ذکر اوپر آیا ہے اس میں انہوں نے تخلیقِ آدم کے بعد سے لے کر اب تک جاری رہنے والے دور کو نظریاتی یا تصوراتی ارتقاء (IDEOLOGICAL EVOLUTION) کا دور قرار دیا ہے — جبکہ ان سطور کے عاجز و ناچیز راقم کے نزدیک ارتقاء کے اولین مرحلے یعنی خالص طبیعیاتی اور کیمیائی ارتقاء، اور دوسرے مرحلے یعنی حیاتیاتی ارتقاء کے بعد ارتقاء کے دو مزید مراحل گزر چکے ہیں، اور تیسرا اس وقت جاری ہے!

ان میں سے پہلا مرحلہ راقم کی رائے میں ”ذہنی ارتقاء“ یعنی ”INTELLECTUAL EVOLUTION“ کا تھا جس کا حاصل یہ تھا کہ انسان

اس قابل ہو جائے کہ حقیقت الحقائق یعنی ذاتِ حق سبحانہ و تعالیٰ، اور عظیم حقائقِ کونیہ سے ”غیب“ میں ہونے اور مادی کائنات کے زنداں میں محبوس ہو جانے کے باوجود کسی ”غیبی اطلاع“ — یعنی وحی ربانی کے بغیر خود اپنی فطرتِ سلیمہ اور عقلِ سلیم کی رہنمائی میں ”آفاق میں گم شدگی“ سے ”ہزار دہائیوں سے نکلا ہوں ایک جنبش میں!“ کے سے انداز میں چھلانگ لگا کر نکل آئے اور گویا کل آفاق کو خود اپنے اندر جذب یا ”گم“ کرتے ہوئے ”منزلِ ما کبریاست!“ اور ”یَزِدَاں بِکَمَدِ آوَرَاے هِمَتِ مردانہ!“ کا نعرہ لگاتے ہوئے ”بَدِیْعُ السَّمُوتِ وَالْأَرْضِ“ اور خالقِ کون و مکان کو نہ صرف پہچان لے بلکہ — ”مال و دولتِ دُنیا“ اور ”رشتہ و پیوند“ کے جملہ ”بتانِ وہم و گمان“ سے ناطہ توڑ کر بالکلیہ اسی کا ہو کر رہ جائے — چنانچہ یہ تھا انسان کے ذہنی و فکری ارتقاء کا وہ مرحلہ اول جس کی تکمیل ہوئی حضرت آدمؑ سے لگ بھگ پانچ ہزار برس بعد حضرت ابراہیمؑ کی شخصیتِ مبارکہ پر جنہوں نے ایسے ماحول میں پیدا ہونے کے باوجود جہاں ہر نوع کے شرک کے گھٹا ٹوپ اندھیرے چھائے ہوئے تھے، چنانچہ بت پرستی بھی تھی، اور ستارہ پرستی بھی، اور سب سے بڑھ کر ”بادشاہ پرستی“ بھی، اپنے ذاتی غور و فکر کے نتیجے میں (واضح رہے کہ سورۃ الانعام کی آیات ۷۶ تا ۷۸ کی ایک تاویل یہ بھی ہے!) یہ فیصلہ کر لیا کہ : ﴿ اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهَیْ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ ۝ ﴾ (آیت ۷۹) یعنی : ”میں نے تو (کل کون و مکان اور ہر چہار سو سے منقطع ہو کر) اپنا رخ اُس ہستی کی طرف کر لیا ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا — بالکل اسی کا ہو کر رہتے ہوئے — اور میں ہرگز (اس کے ساتھ) شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں!“ — چنانچہ یہی وہ توحیدِ کامل تھی جو ان کی پوری شخصیت میں سرایت کر گئی تھی، جس کی بنا پر وہ

ایک جانب ”خلیل اللہ“ قرار پائے، بنھوائے : ﴿وَاتَّخَذَ اللَّهُ ابْنَهُنَّ خَلِيلًا﴾ (النساء : ۱۲۵) تو دوسری جانب اپنے بعد کی پوری نسل انسانی کے امام قرار دیئے گئے، بنھوائے ﴿إِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَامًا ط﴾ (البقرة : ۱۲۴) اگرچہ سب جانتے ہیں کہ انہیں اس مقام کے حصول کے لئے اپنی نظری ”توحید“ کے عملی ثبوت کے لئے ایک سے ایک بڑھ کر کڑے امتحانات اور یکے بعد دیگرے سخت سے سخت تر آزمائشوں اور ابتلاؤں میں سے گزرنا پڑا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شخصیت پر اس ذہنی ارتقاء کی تکمیل کے بعد عمرانی ارتقاء یعنی SOCIAL EVOLUTION کا مرحلہ شروع ہوا، جو عبارت ہے اس سے کہ سرد کے اس شعر کے مصداق کہ ”ملا گوید کہ محمدؐ بالائے آسمان رفت۔ سرد گوید کہ آسمان بہ محمدؐ در شد!“ وہ توحید جو حضرت ابراہیمؑ کی پوری شخصیت میں سرایت اور آنجنابؐ کے روئیں روئیں میں حلول کر کے گویا پوری طرح INTERNALISE ہو گئی تھی، جس سے ایک فرد کی حد تک ”تَخَلَّقُوا بِأَخْلَاقِ اللَّهِ“ کا تقاضا تمام و کمال پورا ہو گیا تھا۔ جس کے نتیجے میں صداقت اور وفا شعارى، اور حلم و تحمل کے جملہ اوصافِ عالیہ کا کامل انعکاس حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شخصیت میں ہو گیا تھا — اب وہ EXTERNALISE ہو، اور انسانی معاشرے اور اجتماعیت میں سرایت کر کے ایک ایسی ریاست وجود میں لے آئے جس میں ذاتِ حق سبحانہ، و تعالیٰ کی حاکمیتِ مطلقہ اور ربوبیتِ عامہ پورے طور پر منعکس اور ”مشہود“ ہو جائیں اور اس طرح اس کی وہ شانِ تمام و کمال ظاہر

۱ ”اور ابراہیمؑ کو تو اللہ نے اپنا خلیل بنالیا تھا۔“

۲ ”میں تجھے سب لوگوں کا پیشوا بنانے والا ہوں۔“

۳ ترجمہ شعر: ”ملا کہتا ہے کہ محمدؐ علیہ السلام آسمان پر تشریف لے گئے، لیکن سرد کا کہنا ہے کہ

آسمان محمدؐ علیہ السلام کے اندر اتر گیا۔“

۴ ”اللہ تعالیٰ کے اخلاق سے متصف ہو جاؤ!“

ہو جو اس کے نام نامی ”العدل“ اور صفت مبارکہ ﴿قَائِمًا بِالْقِسْطِ﴾ (آل عمران : ۱۸) میں بیان ہوئی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم میں حضرت ابراہیمؑ سے قبل کے جن تین رسولوں کا ذکر بار بار آیا ہے یعنی حضرت نوحؑ، حضرت ہودؑ اور حضرت صالحؑ — ان کی قوموں کا صرف ایک ہی مرض بیان ہوا ہے یعنی شرک، اس لئے کہ محسوس ہوتا ہے کہ اُس وقت تک انسانی تمدن اتنا سادہ اور فطرت سے اتنا قریب تھا کہ ابھی جنسی بے راہ روی اور معاشرتی فساد، مالی لوٹ کھسوٹ اور معاشی استحصال، اور سیاسی جبر و استبداد یا ”مُستکبرین“ اور ”مُستضعفین“ کی تقسیم ایسے عمرانی و تمدنی امراض پیدا ہی نہیں ہوئے تھے — لیکن حضرت ابراہیمؑ کے زمانے ہی سے یہ نظر آتا ہے کہ انسان کی ہیئت اجتماعی کے ان مفاسد اور امراض خبیثہ کا آغاز ہو جاتا ہے — چنانچہ حضرت لوط علیہ السلام مبعوث ہوئے سدوم اور عامورہ کی بستیوں کی جانب جہاں جنسی بے راہ روی (SEXUAL PERVERSION) بدترین اور مکروہ ترین صورت میں نمودار ہوئی، پھر حضرت شعیب علیہ السلام اٹھائے گئے اپنی قوم مدین یا مدیان میں، جس میں مالی لوٹ کھسوٹ کی مختلف صورتوں کا رواج ہو گیا تھا۔ اور پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مبعوث کیا گیا بالخصوص فرعون اور اس کے سرداروں کی جانب جنہوں نے ایک قوم (بنی اسرائیل) پر جبر و استبداد اور جو ر و ظلم کی حد کر دی تھی، ”مفحوائے الفاظ قرآنی : ﴿إِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْأَرْضِ وَجَعَلَ أَهْلَهَا شِيَعًا يَسْتَضِعُّ مِنْ طَائِفَةٍ مِنْهُمْ يُذَبِّحُ أَبْنَاءَهُمْ وَيَسْتَحْيِي نِسَاءَهُمْ ۚ إِنَّهُ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِينَ﴾ (القصص : ۳)

ان تینوں جلیل القدر رسولوں کے ضمن میں یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ اس

اعتبار سے تو کامیابی تینوں ہی کو حاصل ہو گئی کہ تینوں کے مخالفین و معاندین نیست و نابود کر دیئے گئے، تاہم ان کی دعوت کو اس پہلو سے کوئی نمایاں کامیابی حاصل نہیں ہو سکی کہ ان کی قوموں کی بحیثیت مجموعی تقدیر بدل جاتی۔ البتہ ۛ کامیابی صرف حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حاصل ہوئی کہ انہوں نے مجبور و مقہور قوم کو غلامی اور تعذیب سے بالفعل نجات دلادی۔ اگرچہ یہ سب کچھ ہوا معجزات اور خالص خرقِ عادت حوادث و واقعات کے ذریعے — لیکن پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام مبعوث ہوئے انہی بنی اسرائیل کی طرف اُس وقت جبکہ وہ اپنے دینی و اخلاقی زوال کی انتہا کو پہنچ گئے تھے، اور ان کی مذہبی سیادت و قیادت، خواہ وہ احبار پر مشتمل تھی یا رہبان پر، مذہب کی بدترین PERVERSION کے شاہکار کی حیثیت اختیار کر چکی تھی، اور آنجنابؑ نے ان کی اس دُنیا پرستی کا پردہ چاک کیا جو مذہبیت اور دینداری کے پردے میں ہو رہی تھی، اور ان کی حقیقت و رُوحِ دین سے دوری اور بے جان رسم پرستی اور خشک قانونی موشگافیوں پر تیز و تند تنقیدیں کیں — تو ان کے قصر سیادت و پیشوائیت میں تو کوئی ضعف پیدا نہ ہو سکا، لہٰذا انہوں نے آنجنابؑ کو اپنے بس پڑتے تو سولی پر چڑھا دیا، یہ دوسری بات ہے کہ اللہ کی قدرتِ کاملہ اور حکمت بالغہ نے ﴿وَمَا قَتَلُوهُ وَمَا صَلَبُوهُ وَلَٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ﴾ (النساء : ۱۵۷) کی صورت پیدا کر دی اور آنجنابؑ کو زندہ آسمان پر اٹھالیا — گویا حضرت ابراہیم علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک تمام رسول معاشرتی، معاشی اور سیاسی بے راہ روی اور بے اعتدالی،

۱۔ ”واقعہ یہ ہے کہ فرعون نے زمین میں سرکشی کی اور اس کے باشندوں کو گروہوں میں تقسیم کر دیا۔ ان میں سے ایک گروہ کو وہ ذلیل کرتا تھا، ان کے لڑکوں کو قتل کرتا اور ان کی لڑکیوں کو زندہ رہنے دیتا تھا۔ فی الواقع وہ مفسد لوگوں میں سے تھا۔“

۲۔ ”حالانکہ فی الواقع انہوں نے نہ اس کو قتل کیا نہ صلیب پر چڑھایا، بلکہ معاملہ ان کے لئے مشتبہ کر دیا گیا۔“

اور ظلم و تعدی کے خلاف جہاد تو کرتے رہے لیکن انہیں کہیں کوئی عملی کامیابی حاصل نہ ہو سکی! (واضح رہے کہ حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہم السلام اول تو رسول نہیں صرف نبی تھے — اور ثانیاً انہوں نے اپنے دور حکومت میں جو عدل و انصاف کی جھلک دکھائی، وہ اس حکومت و اقتدار کی بنا پر تھی جو ان کی دعوت و جہاد کے نتیجے میں نہیں بلکہ محض اتفاقی یا حادثاتی انداز میں خالص وہی طور پر عطا ہوئی تھی۔)

تاہم حضرت عیسیٰؑ سے چھ سو سال بعد بعثت ہوئی محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی جنہیں اقبال نے بجا طور پر ”آیہ کائنات کا معنی دیر یاب“ قرار دیا جس کی تلاش میں ”قافلہ ہائے رنگ و بو“ کو بہت دور دراز اور طویل سفر طے کرنا پڑا — اس لئے کہ ایجاد و ابداع کائنات سے لے کر تخلیق و تسویہ تک کے جملہ مراحل تنزل و ارتقاء اور پھر ﴿قَدْ زُفِّهِدَى ۝﴾^۱ (الاعلیٰ : ۳) کے طویل سفر کی منزل مقصود آپ ہی کی ذات مبارکہ تھی، جس نے ”توحید“ کو بہ تمام و کمال EXTERNALISE کر کے شہنشاہ ارض و سموات اور جملہ مخلوقات کے پالنہار کی حاکمیت مطلقہ اور ربوبیت عامہ پر مبنی معاشرہ اور ریاست بالفعل قائم کر دی۔ یعنی زمین پر اللہ کی خلافت کا کامل نظام عملاً قائم کر دیا۔ اور اس طرح نوع انسانی کے عمرانی ارتقاء کا مرحلہ اصولی اعتبار سے پایہ تکمیل کو پہنچ گیا۔

واضح رہے کہ اقبال کے اس مصرعے کے طے ”تیری نگاہ ناز سے دونوں مراد پا گئے!“ کے مصداق آنحضور ﷺ کی ذات اقدس کے ذریعے کاروانِ انسانیت اور قافلہ انبیاء و رسل ”دونوں“ اپنی آخری ”معراج“ کو پہنچ گئے — قافلہ انبیاء و رسل اس اعتبار سے کہ ذات حق سبحانہ و تعالیٰ جو خود ﴿قَائِمًا بِالْقِسْطِ﴾ ہے، کے جاری کردہ سلسلہ بعثت انبیاء و رسل اور

۱ ”اندازہ ٹھہرایا“ پھر راہ معین کی۔“

تذیل کتاب و میزان کا اصل مقصد — یعنی ﴿لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ﴾^۱ (الحمد : ۲۵) آپ ہی کے ذریعے پورا ہوا — اور کاروانِ انسانیت اس اعتبار سے کہ اس نظامِ عدل و قسط کے قیام کے لئے جو جدوجہد آپ نے کی وہ خالص انسانی سطح پر، سلسلہ اسباب و علل کے حصار میں رہتے ہوئے، اور ٹھوس زمین پر قدم بہ قدم چلتے ہوئے کی۔ جس سے انسان کی عظمت آشکارا ہوئی۔ اور علامہ اقبال کے اس شعر کے مصداق جو انہوں نے غالب کی شان میں کہا ہے کہ — ”فکرِ انساں پر تری ہستی سے یہ روشن ہوا۔ ہے پر مرغِ تخیل کی رسائی تا کجا!“ آپ اور آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی سعی و جد، محنت و مشقت، ایثار و قربانی، صبر و مصابرت، اور ثبات و استقامت سے یہ حقیقت ”روشن“ اور مبرہن ہوئی کہ انسان واقعی خالقِ ارض و سما کی تخلیق کا شاہکار اور حقیقتاً اشرف المخلوقات ہے! جس میں اللہ تعالیٰ نے قوت و صلاحیت کے اتھاہ خزانے ودیعت کئے ہیں!

الغرض، اصولی اعتبار سے ”انسانِ کامل“ اور ”رسولِ کامل“ صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور پر ایجاد و ابداع، تخلیق و تسویہ، اور تقدیر و ہدایت کا وہ طویل سفر طے ”شکر صد شکر کہ جمّازہ بمنزلِ رسید“ کے مصداق اپنی منزلِ مقصود پر پہنچ گیا جو تنزلات اور ارتقاء کے طویل اور پیچ در پیچ مراحل سے گزرا تھا — اور اب اس کا صرف ایک ضمنی مرحلہ باقی ہے، یعنی یہ کہ جو بلند چھلانگ محمد رسول اللہ ﷺ نے انسانی معاشرے اور اجتماعیت کو آج سے چودہ سو سال قبل لگوائی تھی وہ طے ”خدا را آں کرم بارے دگر کن!“ کے مصداق دوبارہ لگے اور اس شان سے لگے کہ کل روئے ارضی اور پورے عالمِ انسانیت کو اپنی آغوشِ رحمت میں لے لے لے — چنانچہ یہی ہے ”نوعِ انسانی کے عمرانی

ارتقاء“ کی وہ آخری منزل جس کی جانب قافلہ انسانیت خواہی نخواہی کشاں کشاں بڑھ رہا ہے، اس حال میں کہ اس کی جھولی میں علم و حکمت اور بالخصوص اعلیٰ سماجی اقدار کی جو بھی ”خیر“ موجود ہے وہ فی الحقیقت محمد رسول اللہ ﷺ ہی کی ”خیرات“ ہے، اور اس ”خیر“ کی تکمیل کی ”آرزو“ کے ضمن میں وہ اس وقت بالکل اسی طرح ”تلاشِ مصطفیٰ“ میں سرگرداں ہے جیسے اربوں سال قبل ”قافلہ ہائے رنگ و بو“ نکلے تھے! — بقول اقبال :

ہر کجا بنی جہانِ رنگ و بو آنکہ از خاکش بروید آرزو
یا ز نورِ مصطفیٰ^۱ او را بہاست یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفیٰ^۲ است

چنانچہ یہ امر قطعاً شدنی اور اٹل ہے کہ ارتقاءِ نوعِ انسانی کی یہ آخری منزل لازماً آکر رہے گی، اور کل روئے ارضی اور پورے عالمِ انسانیت پر وہ نظامِ عدل و قسط سایہ فگن ہو کر رہے گا جو محمد رسول اللہ ﷺ کی ”رحمتٌ للعالمین“ کا سب سے بڑا مظہر ہے۔ اس لئے کہ متعدد صحیح اور مستند احادیث میں آنحضور ﷺ کی یہ صریح اور واضح پیشین گوئیاں وارد ہوئی ہیں کہ :

(۱) ”اللہ تعالیٰ نے میرے لئے ساری زمین کو لپیٹ دیا۔ چنانچہ میں نے اس کے سارے مشرق بھی دیکھ لئے اور سارے مغرب بھی۔ اور (سن رکھو کہ) میری امت کی حکومت ان تمام علاقوں پر قائم ہو کر رہے گی جو زمین کو لپیٹ کر مجھے دکھادیئے گئے ہیں!“ (صحیح مسلم عن ثوبانؓ رسول اللہ ﷺ)

(۲) ”کل روئے زمین پر نہ کوئی اینٹ گارے کا بنا ہوا گھر بچے گا، نہ اونٹ کے بالوں کے کسبوں سے بنا ہوا خیمہ، جس میں اللہ کلمہ اسلام کو داخل نہ کر دے، خواہ وہ عزت والے کے اعزاز کے ساتھ ہو خواہ کمزور کی مغلوبیت کی بنا پر — یعنی یا تو گھراور خیمے والوں کو اللہ یہ اعزاز عطا فرمائے گا کہ وہ خود اسلام میں داخل ہو جائیں گے، یا دوسری صورت میں اللہ انہیں مغلوب

فرمادے گا، چنانچہ وہ (اسلامی ریاست کی) تابعداری اختیار کر لیں گے!“
 — اس پر راوی نے کہا : ”تب وہ بات پوری ہوگی جو فرمانِ الہی ﴿وَيَكُونُ الدِّينُ كُلُّهُ لِلَّهِ﴾ (الانفال : ۳۹) میں وارد ہوئی ہے۔“
 (مسند احمد عن مقداد بن الاسود رضی اللہ عنہ)

اور خود قرآن حکیم میں وارد شدہ صغریٰ و کبریٰ کا منطقی نتیجہ بھی یہی ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں تین بار تو یہ الفاظِ مبارکہ ہو بہو اور جوں کے توں وارد ہوئے کہ : ﴿هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ﴾ (التوبہ : ۳۳، الفتح : ۲۸، الصف : ۹) گویا آنحضور ﷺ کا مقصد بعثتِ غلبہ دینِ حق ہے — اور پانچ مرتبہ مختلف الفاظ میں ادا ہوا یہ مضمون کہ آپ کی بعثت پوری نوعِ انسانی کے لئے ہے، جن میں سب سے زیادہ واضح اور صریح الفاظ یہ ہیں کہ ﴿وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَافَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيرًا وَنَذِيرًا....﴾ (سبا : ۲۸) یعنی آپ کی بعثت پوری نوعِ انسانی کے لئے ہوئی تھی — لہذا منطقی طور پر آپ کی بعثت کا مقصد بتمام و کمال اسی وقت پورا ہو گا جب وہ صورت پیدا ہو جائے گی جو متذکرہ بالا احادیث میں بیان کی گئی ہے!

چنانچہ علامہ اقبال کی اس نگاہ نے جس کے بارے میں خود ان کا کہنا ہے کہ ”گاہ مری نگاہ تیز چیر گئی دلِ وجود!“ — مستقبل کے پردوں کو چیر کر اُس آنے والے دور کی کوئی جھلک دیکھ لی تھی، جب یہ فرمایا کہ :

۱ ”اور دینِ کل کا کل اللہ ہی کے لئے ہو جائے۔“

۲ ”وہی (اللہ) تو ہے جس نے اپنے رسول (محمد ﷺ) کو الہدئی (قرآن حکیم) اور دینِ حق کے

ساتھ بھیجا ہے تاکہ اسے پورے کے پورے دین پر غالب کر دے۔“

۳ ”اور (اے نبی!) ہم نے آپ کو تمام انسانوں کے لئے بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے۔“

آسماں ہو گا سحر کے نور سے آئینہ پوش
 اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی
 پھر دلوں کو یاد آ جائے گا پیغامِ سجود
 پھر جبینِ خاکِ حرم سے آشنا ہو جائے گی
 آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں
 محو حیرت ہوں کہ دُنیا کیا سے کیا ہو جائے گی
 شب گریزاں ہو گی آخر جلوۂ خورشید سے
 یہ چمن معمور ہو گا نغمہ ر توحید سے

البتہ دو باتیں واضح رہنی چاہئیں : ایک یہ کہ یہ سب کچھ از خود نہیں ہو جائے گا بلکہ اللہ اور محمد ﷺ پر ایمان رکھنے والوں کی اسی طرح کی جدوجہد، محنت و مشقت، ایثار و قربانی، صبر و مصابرت، ثبات و استقلال، اور سرفروشی و جانفشانی سے ہو گا جس کا نقشہ ”مُحَمَّدٌ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهُ“ کی پاک سیرتوں میں نظر آتا ہے اور دوسری یہ کہ اس خوشگوار اور جاں فزا منظر سے قبل موجودہ اُمتِ مُسلمہ کی پیٹھ پر دینِ حق کے سواءِ السبیل اور صراطِ مستقیم سے انحراف کے باعث عذابِ الہی کے وہ کوڑے بھی پڑ کر رہیں گے جن کی خبریں کتبِ احادیث کے ابوابِ فتن، ملاحم اور اشرط الساعۃ اور علاماتِ قیامت میں دی گئی ہیں! — تاہم اس تادیب و تعزیر کے بعد ”نورِ مصطفیٰ“ صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام و کمال ظہور و بروز کا دور آ کر رہے گا —! اور اس کا راستہ نہ ابلیسِ لعین اور اس کے شیاطینِ جن و انس پر مشتمل لشکرِ روک سکیں گے، نہ ”یورپ کی مشینیں“ اور ان کی آسماں سے بات کرنے والی ٹیکنالوجی روک سکے گی!

اور یہی ارتقائے انسان کی وہ آخری منزل ہو گی جس کے بعد قیامت آ جائے گی اور وہ سلسلہ کون و مکان جو BIG BANG سے شروع ہو کر آج

تک پھیل رہا ہے ﴿يَوْمَ نَطْوِي السَّمَاءَ كَطَيِّ السِّجِلِّ لِلْكُتُبِ ط كَمَا بَدَأْنَا
 أَوَّلَ خَلْقٍ نُعِيدُهُ ط﴾ (الانبیاء : ۱۰۴) کے انداز میں لپیٹ اور سمیٹ لیا جائے گا
 — اور اس کے بعد کون جان سکتا ہے کہ ﴿كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ ط﴾
 (الرَحْمٰن : ۲۹) کی شان رکھنے والا ”الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ“ اس ”شکست و
 رواں شد!“ کی کیفیت کے بعد تکوین و تخلیق کی کونسی نئی بساط بچھائے گا — !
 ہم یقین کے ساتھ تو صرف یہ جانتے ہیں کہ ﴿كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ۝ وَيَبْقَىٰ وَجْهُ
 رَبِّكَ ذُو الْجَلَلِ وَالْإِكْرَامِ ۝﴾ (الرَحْمٰن : ۲۶، ۲۷)
 وَاخِرُ دَعْوَانَا اِنَّ الْحَمْدَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ !

- ۱۔ ”وہ دن جبکہ ہم آسمان کو یوں لپیٹ کر رکھ دیں گے جیسے طومار میں اوراق لپیٹ دیئے جاتے
 ہیں۔ جس طرح ہم نے تخلیق کی ابتدا کی تھی اسی طرح ہم پھر اس کا اعادہ کریں گے۔“
 ۲۔ ”ہر آن وہ نئی شان میں ہے۔“
 ۳۔ ”ہر چیز جو اس زمین پر ہے فنا ہو جانے والی ہے اور صرف تیرے رب کی جلیل و کریم ذات
 ہی باقی رہنے والی ہے۔“

پاکستان میں نظام خلافت : کیا، کیوں اور کیسے؟

کے موضوع پر امیر تنظیم اسلامی وداعی تحریک خلافت پاکستان

ڈاکٹر اسرار احمد

کی چار تحریریں اور ایک تقریر یکجا کتابی صورت میں شائع کردی گئی ہیں!

تحریریں:

- (1) ۹۱ء میں اجرائے تحریک کے موقع پر پریس کانفرنس میں بیان!
- (2) عہد حاضر میں اسلامی ریاست یا نظام خلافت کا دستوری خاکہ!
- (3) اسلامی ریاست یا نظام خلافت میں سیاسی جماعتوں کا کردار!
- (4) پاکستان کی قومی سیاست میں مذہبی جماعتوں کا کردار!

تقریر:

پاکستان میں نظام خلافت، امکانات، خدو خال اور اس کے قیام کا طریق کار
☆ کتابی سائز ☆ صفحات 96 ☆ سفید کاغذ ☆ دیدہ زیب ٹائٹل

قیمت : 30 روپے